تعارف

قرآن ◎ حدیث ◎ فقہ

شیخ محمد اقبال ایم اے
گورنمنٹ کالج لاہور

علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ — اردو بازار ۔ لاہور

مرکزی کتب خانہ پبلیکیشنز

تعارف

قرآن و حدیث و فقہ

شیخ محمد اقبال ایم، اے

علمی کتاب خانہ - اردو بازار - لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 96465
★ MAILSI ★

قیمت :- ۱۱٫۲۵ روپے

پنجاب آرٹ پریس لاہور

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

تحفۂ درویش

حضرتِ اِسکندرِ دینؒ، خُلدِ بالا کے مکیں
نیّرِ جانِ یتیماں، نورِ ایماں کے امیں

آدمؑ و حوّاؑ کی دُنیا میں حمیّت کا چراغ
مادرِ اقبالِ مسکیں، رہبرِ قُدسی جبیں

میرے مولا نے دیے مجھ کو معانی کے گُہر
میرے ابّا! میری امّاں! لایا ہوں کیا کیا نگیں

پیش لفظ

تعارفِ قرآن و حدیث و فقہ کی پہلی طباعت نومبر ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ اسے قبولِ عام نصیب ہوا اور یہ کتاب متعدد بار طبع ہوئی۔ مئی ۱۹۶۰ء اور ستمبر ۱۹۶۲ء میں ترمیم و اضافہ ہوا۔ اب پھر نظرِ ثانی اور مزید اصلاح کے ساتھ منظرِ عام پہ آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کا جو خلعت عطا فرمایا ہے امید ہے کہ لیل و نہار کی ہر گردش میں وہ نظر فروز رہے گا۔ کتاب کا لفظ لفظ میرے خلوص اور عرق ریزی کا گواہ ہے۔ میں نے دقیق موضوعات کو سلیس انداز اور جدید زاویۂ نظر سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ کامیابی اور سرخروئی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی ذاتِ کریمی کا شکر کیسے ادا کروں جس نے مجھے قلب و نظر کا سامان دے کر جذب و شوق کی راہ پہ گامزن کیا۔ وہ ہر قدم پہ ناصر و یاور ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حبیب حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ رحمت میں سراپا تشکر ہوں۔ حضورؐ کی نگاہِ عاجز نواز نے ہمیشہ میری بے کسی کی لاج رکھ لی ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ٥

میری ان قلبی اور روحانی کاوشوں میں میرے والدین کے انوار لہرا رہے ہیں۔ والدِ ماجد حضرتِ شیخ سکندر دین رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے صاحبِ عرفاں

اور برگزیدہ اولیاء میں سے تھے۔ ان کی روحانیت ان کے وصال کے بعد بھی میری دستگیر ہے۔ والدۂ ماجدہ دین و دنیا کی حمیت اور غیرت کا روشن چراغ تھیں۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی روشن ضمیری اب بھی سرچشمۂ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے سیراب رکھے۔ آمین،

شیخ محمد اقبال ابن شیخ سکندر دینؒ

عنوانات

(ا) تعارفِ قرآن

بابِ اوّل

اسماء القرآن ۱۱

آیت - سورت ۱۲

وحی ۱۲

نزولِ قرآن ۱۶

مکی اور مدنی آیات ۱۷

بابِ دوم

جمع و ترتیب ۱۹

تدوین ۱۹

صدیقی کارنامہ ۲۲

عثمانی کارنامہ ۲۵

اعراب ۲۸

بابِ سوم

مضامین قرآن ۳۰

بابِ چہارم

قرآن کی اہمیت ۵۷

بابِ پنجم

اعجاز القرآن ۶۲

(ا) حفاظتِ قرآن ۶۲

(ب) اسلوب ۶۲

(ج) پیش گوئیاں ۶۹

بابِ ششم

تفسیر ۷۱

تفسیر کا مفہوم ۷۱

تاریخ تفسیر ۷۳

بابِ ہفتم

اسباب نزول ۸۷

محکم و متشابہ ۹۱ ناسخ و منسوخ ۹۳

(۲) تعارفِ حدیث

باب اوّل	۳
اصطلاحات	۵
اقسامِ حدیث	۱۴
بابِ دوم (اہمیتِ حدیث)	۲۵
حدیث قرآن کی نگاہ میں	۲۷
حدیث رسول اللہ کی نگاہ میں	۴۳
حدیث صحابۂ کرام کی نگاہ میں	۵۷
حدیث عہدِ صحابہ کے بعد	۷۱
حدیث پر ایک عمومی نگاہ	۷۳
بابِ سوم (تدوینِ حدیث)	۷۷
پہلا دَور	۷۸
دوسرا دَور	۸۳
تیسرا دَور	۸۷
چوتھا دَور	۹۱
وضعِ حدیث	۹۱
اقسامِ کتبِ حدیث	۹۶
ہمہ گیر کتب کا آغاز	۹۷
صحاحِ ستّہ	۹۸
تکمیلی جہد	۱۰۱

(۳) تعارفِ فقہ

باب اوّل	
اصطلاحات	۷
باب دوم	
مآخذ فقہ	۱۲
کتاب اللہ	۱۵
سنت	۱۸
اجماع	۲۰
قیاس	۲۲
ضمنی مآخذ	۲۵
استحسان	۲۵
مصالح مرسلہ	۲۶
عرف	۲۸
باب سوم	
تدوین فقہ	۲۹
پہلا دَور	۲۹
دوسرا دَور	۳۳
تیسرا دَور	۳۶
چوتھا دَور	۴۰
پانچواں دَور	۴۷
چھٹا دَور	۴۹
مذاہب اربعہ	۵۱
امام ابوحنیفہ	۵۳
امام مالک	۶۹
امام شافعی	۸۳
امام احمد	۹۱

تعارفِ قرآن

از

شیخ محمد اقبال ایم۔اے (عربی)، ایم۔اے (اسلامیات)، ایم۔اے (فلسفہ)
گورنمنٹ کالج۔ لاہور

پبلشرز
علمی کتاب خانہ - اُردو بازار - لاہور

عنوانات

باب اوّل

اسماء القرآن	۱۱
آیت ۔ سورت	۱۲
وحی	۱۲
نزولِ قرآن	۱۶
مکی اور مدنی آیات	۱۷

باب دوم

جمع و ترتیب	۱۹
تدوین	۱۹
صدیقی کارنامہ	۲۲
عثمانی کارنامہ	۲۵
اعراب	۲۸

باب سوم

مضامین قرآن	۳۰

باب چہارم

قرآن کی اہمیت	۵۷

باب پنجم

اعجاز القرآن	۶۲
ا ۔ حفاظتِ قرآن	۶۲
ب ۔ اسلوب	
ج ۔ پیش گوئیاں	۶۹

باب ششم

تفسیر	۷۱
تفسیر کا مفہوم	۷۱
تاریخ تفسیر	۷۳

باب ہفتم

اسبابِ نزول	۸۷
محکم و متشابہ	۸۷
ناسخ و منسوخ	۹۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

اسماءُ القرآن - وحی - نزولِ قرآن

اسماءُ القرآن

قرآن کے لغوی معنی ہیں: جمع کرنا - پڑھنا۔
قرآن حکیم میں انسانی ہدایت کے سب بنیادی اصول اور معرفتِ حقائق کے کل رموز جمع ہیں - علاوہ ازیں یہ اوّل روز سے سپردِ تحریر ہوا اور پڑھا جانے لگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام قرآن رکھا - اللہ تعالیٰ نے اسے مندرجہ ذیل ناموں سے بھی یاد فرمایا ہے:

کتاب: کیونکہ شروع سے تحریری صورت میں ہے۔

فرقان: اس کے لغوی معنی ہیں کسوٹی - قرآن چونکہ حق و باطل کی کسوٹی ہے، اس لئے فرقان کہلایا۔

کلام: اس لئے کہ اللہ کا کلام ہے۔

ذکر: (لغوی معنی ہیں یاد رکھنا یا بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا) قرآن حکیم انسان کو

زندگی کا بھولا ہوا درس یاد دلاتا ہے۔ اس لئے ذکر بھی ہے۔

ھُدًی

شِفَاء وغیرہ

آیت۔سورت قرآنِ حکیم ۱۱۴ سورتوں میں منقسم ہے۔ سورت کے لغوی معنی ہیں: شرف، منزلت اور بلندی۔ اس لفظ کے مادہ میں چار دیواری کا مفہوم بھی شامل ہے[1]۔ قرآن کی سورت سے مراد ایک مستقل قطعہ یا باب ہے۔ اس تسمیہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہر سورت علم و حکمت کی بلندی، اعجاز کے شرف اور قدر و منزلت کی رفعتوں کی مالک ہے۔ اور معانی و مطالب کی ایک ایسی مستحکم فصیل ہے جس میں باطل کسی صورت راہ نہیں پا سکتا۔

سُورت کی جمع سُوَر ہے۔

ہر سُورت آیات سے ترکیب پاتی ہے۔ آیات اکثر فقرات یا جملوں کا حکم رکھتی ہیں لیکن بعض آیات ایسی بھی ہیں جو فقط چند حروف کا مجموعہ ہیں۔

آیت کے لغوی معنی ہیں علامت، نشانی یا معجزہ۔ قرآن کریم کی ہر آیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے جس کا جواب لانا محال ہے۔ ہر آیت ایک معجزہ ہے۔

قرآنِ حکیم کی سورتیں بعض بڑی ہیں، بعض چھوٹی۔ شروع میں سوائے سورۂ فاتحہ کے طویل سورتیں ہیں۔ جوں جوں آگے جاتے ہیں، سورتوں کا طول گھٹتا جاتا ہے۔

وحی قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغام بندوں تک تین ذرائع سے پہنچاتا ہے یعنی:

(۱) اشارۂ سریع یعنی لطیف اور باریک اشارہ۔

(۲) تکلیمِ الٰہی یعنی اللہ تعالیٰ کا خود ہم کلام ہونا۔

(۳) اِرسالِ مَلک یعنی فرشتہ کے ذریعے پیغام بھیجنا۔

---

[1] مقدمۂ تفسیر طبری۔ منجد

ان تینوں صورتوں کے لئے وحی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے لیکن پہلی صورت میں اس کا استعمال فقط لغوی ہے۔ دوسری دو صورتوں میں وحی کا اصطلاحی مفہوم ہے۔ ان سب کی وضاحت مندرجۂ ذیل ہے۔

۱۔ اشارۂ سریع: قرآنِ حکیم میں اس کے لئے وحی کا لفظ لغوی معنی کے ساتھ آیا ہے یعنی سریع (لطیف) اشارہ سے بات سمجھا دینا۔ اسے اِلقاء اور الہام بھی کہتے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں:۔

(ا) جبلّی ادراک: قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ربّ نے شہد کی مکھی کو اس بات کی وحی کی کہ پہاڑوں، درختوں اور عمارات میں گھر بناؤ اور ہر طرح کے پھل کھاؤ[1]۔ انسانی روح کے بارہ میں ارشاد ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس ۹۱: ۸)۔ (اللہ تعالیٰ نے انسان کو بدیوں اور تقوٰی (کے فرق) کا الہام کر دیا)

یہاں وحی اور الہام سے مراد وہ ادراک ہے جو طبیعت یا سرشت میں ودیعت ہوتا ہے۔

(ب) کسی مفہوم کا دل میں وارد ہونا:

اس صورت میں الفاظ نازل نہیں ہوتے۔ دل میں کسی فکر و استدلال کے بغیر بے تامل ایک واضح خیال اترتا ہے۔ مثلاً:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (ہم نے موسٰی کی والدہ کو الہام کیا کہ اسے دودھ پلاؤ) ۲۸: ۷

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ) (۵: ۱۱۱)

---

[1] النحل: ۶۸

اس نوع کا الہام غیرِ نبی کو بھی ہو سکتا ہے۔ غیرِ نبی کا الہام قطعی نہیں ہوتا اور نہ دین میں حجت ہوتا ہے چاہے اس کا وصول کرنے والا کتنی ہی بڑی ہستی کیوں نہ ہو۔ اس الہام سے حاصل شدہ علم کو علم لَدُنّی کہتے ہیں جس کی دلیل قرآن حکیم کی اس عبارت سے لی گئی ہے:

وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (اور ہم نے اسے اپنے پاس سے علم سکھایا)
(پارہ ۱۵۔ رکوع ۲۱)

نبی کا الہام قطعی، واضح اور غیر مبہم ہوتا ہے۔ اس میں شک یا شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ دین میں حجت ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت نبی پر واجب ہوتی ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم پر کثرت سے الہام نازل ہوا ہے، مثلاً نمازوں کی تعداد، ان کی رکعات، ادائے نماز کا طریق وغیرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس الہام کو وحیِ غیر مَتْلُو (وہ وحی جس کی تلاوت نہ کی جائے) کہا جاتا ہے۔

(ج) رویائے صالحہ (اچھا یا نیک خواب): اسے رویائے صادقہ یعنی سچا خواب بھی کہتے ہیں۔ رویائے صادقہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے دیگر بندوں کو بھی ہو سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ غیرِ نبی کا رویاء قطعی نہیں ہوتا۔ نبی کا خواب سراپا واقعیت ہوتا ہے اور سپیدۂ سحر کی طرح۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نزولِ قرآن سے قبل رویائے صالحہ کی صورت میں الہام ہوتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب ہی میں حکم ہوا تھا کہ بیٹے کی قربانی پیش کیجئے۔

وحیِ رحمانی اور وحیِ شیطانی: مذکورۂ بالا مثالیں وحیِ رحمانی کی ہیں۔ بد لوگوں کو بھی وحی ہوتی ہے مگر شیطان کی طرف سے۔ اس کو وحیِ شیطانی کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اس سے خبردار کر دیا ہے: وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ

اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ (اور یقیناً شیاطین اپنے یاروں کے دل میں القاء کرتے ہیں)۔ شیطانی وسوسے اسی قبیل سے ہیں۔ جھوٹے نبی شیطانی الہام سے بہرہ مند رہتے ہیں۔ شیاطین انہیں بارہا صحیح خبریں پہنچا دیتے ہیں۔ سادہ لوح عوام اسے معجزہ یا کرامت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

۲۔ تکلیمِ الٰہی: اس صورت میں اللہ تعالیٰ بغیر واسطہ کے خود نبی سے ہم کلام ہوتا ہے، کبھی پردہ کے پیچھے سے اور کبھی دوبدو۔ اللہ تعالیٰ نے وادیِ سینا میں حضرت موسیٰؑ سے پسِ پردہ کلام کیا۔ حضرت موسیٰؑ کے کان آواز کو سنتے تھے لیکن آنکھ بولنے والے کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات دوبدو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔

۳۔ اِرسالِ مَلَک یعنی فرشتہ کو (پیغام دے کر) بھیجنا: فرشتہ کبھی اصلی ہیئت میں اور کبھی انسانی صورت میں اللہ کا پیغام لے کر آتا ہے۔ اس ذریعہ سے غیر نبی کے لئے بھی پیغام آسکتا ہے۔ مثلاً حضرتِ مریم کے پاس فرشتے پیغامِ الٰہی لاتے رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرتِ جبرئیل علیہ السلام قرآنِ حکیم کی وحی لاتے تھے۔ اس وحی کے لئے تنزیل کا لفظ بھی آیا ہے: وَ اِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۝ (اور وہ یقیناً رب العالمین کی تنزیل ہے۔ جس کے ساتھ روح الامین یعنی جبرئیل نازل ہوئے)[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار سوال ہوا کہ آپؐ کے پاس کس طور سے وحی آتی ہے؟ فرمایا، ہر مرتبہ فرشتہ آتا ہے۔ بعض دفعہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ آتا ہے۔ یہ وحی اس وقت ختم ہوتی ہے جب اسے یاد کر چکتا ہوں۔ یہ وحی مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ کبھی فرشتہ انسانی صورت اختیار کر کے آتا ہے،

---

[1] الشعراء ۱۹۲-۱۹۴

میرے ساتھ کلام کرتا ہے اور میں اس کا کلام یاد کر لیتا ہوں۔

سطورِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ وحی کی قطعی اقسام فقط انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اصطلاحی لحاظ سے وحی کا لفظ اسی قسم کے لیے مستعمل ہے۔ بعض دفعہ اسے وحیِ شرعی اور وحیِ نبوّت بھی کہتے ہیں۔ غیرِ انبیاء کے لئے وحی کا لفظ صرف لغوی معنی میں رائج ہے۔

نزولِ قرآن

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم عمر کے اکتالیسویں برس میں تھے کہ ماہِ رمضان کی ایک رات جب کہ آپؐ شہرِ مکہ سے تین میل دور غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے، حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور قرآنِ حکیم کی یہ آیات پہنچائیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۞

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو بستہ لہو سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب ہے صاحبِ کرم جس نے انسان کو قلم سے علم سکھایا اور اس کو بتا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد وحی وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی۔ یہ تسلسل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام تک رہا۔ قرآنِ حکیم کا نزول ۲۲ سال ۲ ماہ اور ۲۲ دن میں مکمل ہوا۔

قرآنِ حکیم نجماً نجماً یعنی ٹکڑوں میں نازل ہوا۔ قرآنِ حکیم کا وصول کرنا ایک عظیم ذمہ داری تھی جس کا احساس وہی کر سکتا تھا جس پر قرآنِ حکیم نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ خود اسے قولِ ثقیل یعنی وزنی کلام کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ وہ کلام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے پہاڑوں اور زمینوں پر پیش کیا تو وہ کانپ گئے اور اس کے

اٹھانے سے عجز کا اظہار کیا۔ اتنا بڑا بوجھ جو پہاڑوں سے نہ اُٹھ سکا، ایک انسان کے دل پر کس طرح یک بارگی اتارا جا سکتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو عجیب کیفیت گزر جاتی تھی۔ چہرۂ انور پر سرخی دوڑ جاتی اور سخت سردی میں بھی پیشانی مبارک پر پسینہ نمودار ہو جاتا تھا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اتارا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس بارِ ثقیل کا خوگر ہو جائے[۱]

قرآنِ حکیم کے بتدریج نازل ہونے میں ایک اور حکمت بھی نظر آتی ہے۔ اسلام سے قبل عرب کی دینی، معاشرتی اور اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی، ان میں ایک انقلاب لانا مقصود تھا۔ یہ انقلاب شدید مشکلات اور کڑی آزمائشوں کا طالب تھا۔ اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسی تکلیف میں نہیں ڈالتا جو ان کی طاقت سے فزوں ہو۔ قرآنی انقلاب ایک دن میں نہیں آ سکتا تھا، اس کے لئے مہلت اور تدریج کی ضرورت تھی۔ قرآنِ حکیم کے آہستہ آہستہ نازل ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ ساتھ ساتھ ایک مرکزی جماعت قائم ہوتی گئی۔ اس میں درجہ بہ درجہ اس قدر استعداد آ گئی کہ اس نے نہ صرف عرب بلکہ بیرونِ عرب کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال رمضان کے مہینہ میں حضرت جبرئیلؑ سے قرآنِ حکیم کا دور فرماتے تھے۔ زندگی کے آخری رمضان میں دو بار اعادہ فرمایا۔

مکّی اور مدنی آیات

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعد از بعثت کی زندگی کے دو دَور ہیں۔ تقریباً تیرہ برس آپ مکہ میں مقیم رہے۔ اسے مکّی دَور کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔

---

[۱] یہ دلیل سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں ہے۔

اور باقی زندگی جو گیارہ برس کے لگ بھگ ہے وہیں بسر کی۔ اسے مدنی دَور کہتے ہیں۔

نزولِ قرآن کی ابتداء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کا آغاز ایک ہے۔ قرآن کا ایک حصّہ ہجرت سے پہلے نازل ہوا اور ایک بعد میں۔ وہ آیات جو ہجرت سے قبل اُتریں، مکّی آیات کہلاتی ہیں۔ مکّی آیات سے مراد فقط وہ آیات نہیں جو مکّہ میں نازل ہوئیں، بلکہ وہ سب آیات ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں، چاہے مکّہ میں یا مکّہ سے باہر۔ جو آیات ہجرت کے بعد آئیں وہ مدنی آیات کہلاتی ہیں، چاہے ان کا مقامِ نزول مدینہ تھا یا کوئی اور جگہ۔

مکی سورتیں بالعموم مختصر ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ تر ایمان واعتقاد سے ہے۔ ان میں ایمان والوں کے لئے جنّت کی بشارتیں ہیں اور منکرین کو دوزخ کا خوف دلایا گیا ہے۔ مکی دَور اسلام کا ابتدائی دَور تھا۔ اس لئے زیادہ تاکید ایمان پر تھی، کیونکہ ایمان ہی دین کی بنیاد ہے۔ یہ خوب مستحکم ہو جائے تو جبھی اس پر باقی عمارت اٹھانا ممکن ہوتا ہے۔ مکی سورتوں میں خطاب اکثر یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ (اے لوگو) کے الفاظ سے ہے۔

مدنی سورتیں عموماً طویل ہیں۔ مدینہ میں اسلام کی ایک مضبوط اور ذی اقتدار ریاست قائم ہو گئی تھی۔ اس لئے قوانین اور قواعد کی آیات نازل ہونے لگیں۔ اب چونکہ یہود و نصاریٰ سے بھی قریب کا واسطہ تھا، اس لئے ان کا ذکر بھی قرآنِ حکیم میں بکثرت آنے لگا۔ مدنی سورتوں میں خطاب عام طور سے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ہے۔

باب دُوم

جمع و ترتیب

تدوین علمائے سلف کے ہاں جمع و ترتیب کے لئے "تالیف" کا لفظ آیا ہے آج کل اردو زبان میں اس مفہوم کے لئے تدوین کا لفظ رائج ہے۔

قرآن کی تدوین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یہ بات اجماع اور تواتر سے بلا اختلاف ثابت ہے کہ سورتوں اور آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ توقیف کے لغوی معنی ہیں:

واقف کرنا، بتانا، آگاہ کر دینا۔

مراد یہ کہ اس ترتیب سے اللہ تعالیٰ نے جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا تھا۔ اس میں نہ حضورؐ کی رائے یا اجتہاد کو دخل ہے اور نہ آپؐ کے بعد کسی دیگر فرد کی رائے کو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک ایک آیت کا محل و مقام حضرت جبرئیل نے بتایا تھا۔

قرآن حکیم کی سورتوں اور آیات کی ترتیب نزولی اعتبار سے نہیں بلکہ مضامین کے لحاظ سے ہے۔ بعض مختصر سورتیں بہ یک وقت نازل ہوئیں، لیکن دیگر سورتوں کی آیات نوبت بہ نوبت آتی رہیں۔ ضرور نہ تھا کہ ایک سورت کے تمام ہونے کے بعد دوسری سورت کا آغاز ہوتا، بلکہ بعض ایام میں ایک سے زائد سورتوں کا نزول جاری رہا۔ جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابتِ وحی کے لئے خوش نویس اور ماہر کاتب مقرر کر رکھے تھے۔ جب وحی نازل ہوتی اور یہ مکمل طور سے الگ سورت نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کاتب کو حکم دیتے کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں مقام

پر درج کر لو۔ اسی ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اور حفّاظِ قرآن زبانی بھی یاد کر لیتے تھے۔ جمع و ترتیب کا یہ فریضہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی میں اللہ تعالیٰ کی توقیف سے انجام پا گیا۔ قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب اسی وقت سے بعینہٖ چلی آتی ہے، اس میں کوئی ردّ و بدل یا کمی بیشی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا قرآنِ حکیم کے بارے میں اعلان ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ یعنی اس کا جمع کرنا اور پڑھا جانا ہمارے ذمّے ہے۔[1] ربِّ حکیم نے اس مقصد کے لئے اوّل روز سے اہلِ اسلام کے سینے کھول دیئے اور ان کے لئے نوشت و خواند اور تعلیم کے سامان کر دیئے حالانکہ قبلِ اسلام کے عرب قلم اٹھانا عار جانتے تھے۔ فقط ذہنی یادداشت پر انحصار کرتے تھے۔

کلامِ مجید کو بعض صحابہؓ نے لکھ کر پاس رکھ لیا تھا۔ اکثر کے پاس قرآن کے فقط چند اجزاء تھے، لیکن بعضوں کے پاس مکمل قرآن بھی تھا۔

قرآنِ حکیم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آیات شروع ہی سے تحریری حالت میں تھیں اور صحابۂ کرامؓ اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ہم سابقہ اوراق میں بتا آئے ہیں کہ اسی سبب سے اس کو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور قرآن کے نام دیئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل آیات اس کی مزید تائید کرتی ہیں:۔

۱۔ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ (قسم ہے لکھی ہوئی کتاب کی جو کشادہ ورق میں ہے) (۵۲: ۲، ۳)

۲۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (یہ آبرو والا قرآن ہے۔ ایک غلاف پوش کتاب میں ہے۔ اس

---

[1] القیٰمۃ (۷۵: ۱۷)

کو صرف پاکیزہ لوگ چھوتے ہیں[1])

اس وقت کاغذ کی بہت قلت تھی؛ جو کاغذ دستیاب تھا وہ بھی ازبس گراں تھا۔ بعض صحابہؓ نے کاغذ (قرطاس) پر بھی قرآن حکیم لکھا۔ لیکن بالعموم کھجور کی چھال پتھر کی لوحوں، اونٹ کے شانہ کی چوڑی ہڈیوں اور چمڑے کے ٹکڑوں وغیرہ پر آیات ثبت کر لیتے تھے۔ ان مختلف النوع ٹکڑوں کی شیرازہ بندی کیونکر ممکن تھی؟ اس لئے جلد بستہ کتاب کی صورت میں قرآن کا کوئی نسخہ نہ تھا[2] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ قرآن اپنی صحیح ترتیب و تدوین کے ساتھ حُفّاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ قرآن کا حفظ کرنا بے اندازہ ثواب کا موجب ہے۔ صحابۂ کرامؓ اس کارِ خیر میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے[3]

قرآنِ حکیم کی حفاظت کا اوّلین وسیلہ ہمیشہ سے حُفّاظِ کرام کا حافظہ رہا ہے[4] شروع میں کئی برس تک قرآن میں اِعراب کا رواج نہ تھا۔ اِعراب کے وجود میں آنے کے بعد بھی ان کو آخری اور مکمل صورت کہیں دو تین صدی بعد دی گئی۔ لوگ حافظہ کی مدد سے اور سینہ بہ سینہ کی تعلیم سے صحیح پڑھ لیتے تھے۔ حضرت امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) اور بعض دیگر علماء کی رائے تھی کہ اِعراب صرف الہٰی

---

[1] الواقعہ ۵۶: ۷۹ [2] فتح الباری ۸: ۱۵۷ [3] قصیدہ رائیہ شعر نمبر ۲۱

[4] حضرت شاہ عبد القادر سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۹ کی شرح میں یوں رقمطراز ہیں: یعنی پیغمبر نے کسی سے نہیں پڑھا (یعنی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا) بلکہ یہ وحی جو اس پر آتی ہمیشہ کو بن لکھے جاری رہے گی۔ سینہ بہ سینہ اور کتابیں حفظ نہ ہوتی تھیں۔ یہ کتاب حفظ ہی سے باقی ہے۔ لکھنا افزود ہے۔ مجموعہ تفسیر فراہی (ص ۱۲۴) میں ہے کہ صحابہؓ نے قرآن کو زبانی محفوظ کیا۔ پھر مزید حفاظت کے لئے اس کو مصحف میں جمع کر لیا۔

نسخوں میں درج کیئے جائیں جو نو آموز طلبہ کے لئے ہوں۔ انہیں پسند نہ تھا کہ مشق یافتہ اصحاب اعراب والے نسخوں سے پڑھیں[1]

سطور بالا کے پیشِ نظر ہمارا دعویٰ ہے کہ جہاں تک قرآن حکیم کی محض ترتیب اور حفاظت کا تعلق ہے، اگر قرآن کبھی سپردِ قلم نہ ہوتا تو بھی فرق نہ پڑتا۔ لیکن تحریر اور کتابت کے بھی بے بہا فوائد ہیں۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں اس کا بھی اہتمام کیا گیا۔

صدیقی کارنامہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مُسیلمہ کذّاب سے اہلِ اسلام کی ایک خون ریز جنگ ہوئی۔ کئی مسلمان جامِ شہادت پی گئے۔ ان میں ستّر (۷۰) حفّاظ قرآن بھی تھے[2]

اِن حُفّاظ کو قرآنِ حکیم نہ صرف زبانی یاد تھا، بلکہ ان کے پاس اس کے تحریری اجزاء بھی تھے جو مل کر ایک نسخہ کے برابر ہوتے تھے[3] جو حافظ صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرّف تھے، ان میں سے بعضوں نے آپؐ کی زبانِ مبارک سے براہِ راست سُن کر قرآنِ حکیم لکھ لیا تھا، ان کی تحریروں کا کھو جانا ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ ایسے مستند نوشتے مشکل سے میسّر آسکتے تھے۔

اس وقت عرب کے چپّہ چپّہ میں باغیوں اور مرتدوں کے خلاف جنگ کے محاذ کھلے ہوئے تھے۔ شمعِ حق کے پروانے دیوانہ وار جانیں نثار کر رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا:
یمامہ کے روز متعدد حفّاظِ قرآن جہاد کی نذر ہو گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ سب مقاماتِ جنگ میں حفاظِ کرام اسی طرح جانیں دیتے رہے تو قرآن مجید کا ایک کثیر حصّہ کھو

---

[1] اتقان۔ نوع ۷۶۔ [2] فتح الباری [3] فتح الباری

جائے گا۔ میری رائے ہے کہ آپ قرآنِ حکیم کو جمع کرنے کا حکم دیں[۱]۔

حضرت ابوبکرؓ نے پہلے تو اس تجویز کو اہمیت نہ دی اور کہا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کیا، اُسے میں کیسے ہاتھ لگا سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اس میں بھلائی ہے۔ آپ حضرت ابوبکرؓ سے اصرار کرتے رہے، حتیٰ کہ انہیں قائل کر لیا[۲]۔ فیصلہ ہوا کہ وہ تمام نوشتے جمع کئے جائیں جو حفاظ نے براہِ راست رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھے ہیں، اور ان کو نقل کر لیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس مہم کے لئے حضرت زیدؓ بن ثابت کو منتخب کیا۔ جو ایک کامل الفن کاتب تھے۔ انہوں نے کئی برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر وحی کی کتابت کی تھی۔ آنحضورؐ جس وقت ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے اس وقت انصار کے اس دُرِ یتیم کی عمر کل گیارہ برس تھی، لیکن قرآن سے عشق اور حافظہ کی خداداد سرعت کا یہ حال تھا کہ سترہ سورتیں ازبر کر چکے تھے[۳]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ذہانت دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور انہیں یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زیدؓ نے مہینوں نہیں بلکہ دنوں میں اس قدر مہارت پیدا کر لی کہ یہود کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات لکھنے لگے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت زیدؓ جوانی کی منزل میں تھے۔ پورا قرآن یاد تھا۔ اس عمر میں ذہنی قُوٰی شباب پر ہوتے ہیں، اس لئے بھول چوک کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم قریشی رسم الخط میں لکھا جاتا تھا اور حضرت زیدؓ کی قراءت قریشی تھی[۴]۔ الغرض ان اسباب کی بناء پر حضرت صدیقؓ کی نظرِ انتخاب حضرت زیدؓ

---

[۱] ترمذی ابواب التفسیر بخاری باب جمع القرآن، کتاب التفسیر وکتاب الاحکام فتح الباری ۹-۱۰۔

[۲] ترمذی ابواب التفسیر صحیح بخاری [۳] تذکرۃ الحفاظ [۴] فتح الباری

پر گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے جناب زیدؓ کو بلوا کر کہا کہ تم نوجوان اور عاقل ہو اور ہمیں تمہارے بارہ میں کوئی بدگمانی نہیں ——— یعنی دیانت، حافظہ یا اہلیت کے بارہ میں ——— تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے، اس لئے قرآنِ حکیم کے اجزاء کو تلاش کر کے جمع کرو[1]۔ اور قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ لکھ لو۔ حضرت زیدؓ نے پس و پیش کیا اور کہا کہ جو کام نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود نہیں کیا ہم کیوں کریں۔ لیکن جناب ابوبکرؓ اور عمرؓ کے اصرار کے سامنے انہیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

یہ ایک گراں بار فریضہ تھا۔ حضرت زیدؓ کو معتبر ذرائع سے ان نوشتوں کو اکٹھا کرنا تھا جو ہادیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے سُن کر لکھے گئے تھے۔ اس کے لئے انتہائی احتیاط اور محنت کی ضرورت تھی۔ حضرت زیدؓ کا قول ہے کہ اگر اس فرض (یعنی اجزائے قرآن کو ایک کتاب میں منتقل کرنے کے بجائے مجھے پہاڑ اٹھا کر منتقل کرنے کا حکم ہوتا تو اسے آسان تر سمجھتا[2]۔

عوام میں اعلان کر دیا گیا کہ جس صحابیؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سن کر قرآنِ حکیم کا کچھ حصہ لکھ رکھا ہو، اسے پیش کرے۔ لوگوں کے پاس چمڑے کے ٹکڑوں اور لکڑی اور پتھر وغیرہ کی تختیوں پر جو آیات تھیں، اٹھا لائے۔ ان کو جمع کر کے قرآنِ حکیم کا ایک مکمل نسخہ معاطہ تحریر میں لایا گیا۔

---

[1] کتاب المصاحف صفحہ ۸ سطر ۲، ۳۔ دَعَانِی اَبُوبَکرٍ فَقَالَ ..... اجمع القرآن فاکتبہ۔

[2] ترمذی ابواب التفسیر فتح الباری ۲: ۲۵۵ کتاب مصاحف۔ (قوسین کے درمیانہ الفاظ مؤلف بذا کے ہیں)

حضرت زیدؓ خود حافظِ کتاب تھے۔ لیکن احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی صحابیؓ قرآن کا نوشتہ لاتے تو کم از کم دو حافظوں کی شہادت لی جاتی کہ یہ نوشتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سن کر لکھا گیا ہے۔[۱]

الغرض نہایت تحقیق اور جاں فشانی کے ساتھ قرآنِ حکیم کو قرطاس یعنی کاغذ پر نقل کیا گیا۔ یہ نقل الگ الگ صحیفوں یا اوراق کی صورت میں تھی۔ اسے صُحُف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اوراق کی شیرازہ بندی نہیں ہوئی تھی۔

صُحُف، صحیفہ کی جمع ہے۔ مراد ہے، اوراق۔

حضرتِ زیدؓ کے کام کی اصل اہمیت یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سُنے ہوئے تحریری اجزا کو ڈھونڈ کر ان کی نقل کی گئی۔ لہٰذا حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کے عہد کے اعتبار سے جمعِ قرآن سے یہی مراد ہے۔

حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری[۲] میں جمعِ قرآن کے دو معنی بتائے ہیں:

(۱) قرآن کے متفرق اجزاء کا صُحُف یعنی کاغذ کے اوراق میں نقل ہونا۔

اور

(۲) صُحُف کا ایک مُصحَف کی صورت میں شیرازہ بند ہونا (جیسا کہ حضرتِ عثمانؓ کے عہد میں ہوا)

صُحُف پہلے حضرت ابوبکرؓ کی تحویل میں رہے۔ بعدہٗ ان کے جانشین حضرت عمرؓ کی حفاظت میں آئے۔ ان کی وفات کے بعد اُن کی صاحبزادی اُمُّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے سپرد رہے۔[۳]

عثمانیؓ کارنامہ

عرب میں متعدد قبائل ہیں جن کی بولیوں میں کچھ کچھ اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ بعض دفعہ مختلف لہجے اور تلفظ سے بولا

---

۱ فتح الباری ۲: ۲۵۵۔ کتاب المصاحف۔ اتقان ۲ فتح الباری (مطبوعہ مصر۔ جلد ۱۰)
۳ جلد۔ الصفحہ ۳۸۶

جاتا ہے۔ مثلاً بعض قبیلے یَفعَلُ کو یِفعَلُ اور اسلم کو عَسلم بولتے ہیں۔ بعض قبیلوں میں جمع کی علامت بجائے نوُن کے میم ہے۔ الغرض لہجے اور لفظ کے تلفّظ کے لحاظ سے ہر بولی کے انفرادی خصائص ہیں۔

لہجے اور تلفّظ کا مجموعی نام عربی میں قراءت ہے۔ ملک عرب میں قراءت یعنی بولیوں کے اختلاف کے لحاظ سے سات بڑے گروہ تھے، اس لئے ہر قبیلہ کو اپنی قراءت کے بموجب قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ اختلافِ قراءت سے معانی میں کوئی بنیادی فرق نہیں آتا۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت تک اسلامی فتوحات کے قدم دُور دُور تک بڑھ چکے تھے۔ کئی غیر عرب اقوام بھی رشتۂ اسلام میں منسلک ہو گئیں۔ انہیں قرآن پڑھنے کے لئے عربوں کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ عربوں میں قراءت کا اختلاف تھا، اس لئے نومسلموں میں بھی اس کا اثر رونما ہوا۔ اس فرق میں بنیادی لحاظ سے تو کوئی قباحت نہ تھی، لیکن سیدھے سادے عوام بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھی جو درحقیقت اختلافات نہیں ہوتے مضبوطی سے تھام لیتے ہیں اور ان پر ایسے اَڑ جاتے ہیں گویا یہی عقیدہ کی جان ہیں۔ کبھی کبھار ان میں شدید تکرار بلکہ سر پھٹول تک کی نوبت آجاتی ہے۔

• عثمانی عہد میں ایک صحابی حضرت حُذیفہؓ عراق اور ایران کی شمالی سرحدوں پر جہاد کے لئے گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ بعض افراد اپنی اپنی قراءت کو حق بجانب ٹھہرانے میں حد سے گذر رہے ہیں اور اس نوبت کا احتمال ہے کہ ہر قبیلہ صرف اپنی قراءت کو صحیح سمجھے اور دوسروں کو برسرِ غلط قرار دے۔ انجام یہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کے بارہ میں نزاع اٹھ کھڑی ہوگی۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ از ابن کثیر۔

حضرت حُذیفہؓ واپس آئے۔ حضرت عثمانؓ سے یہ صورتِ حال بیان کی، اور عرض کیا کہ آپ اس نازک موقع پر ملّت کی دستگیری کریں اور اُٹھتے ہوئے افتراق کا سدِّباب کریں[۱]۔ حضرت عثمانؓ نے یہ معاملہ صحابہؓ کے سامنے رکھا۔ سب نے متفق ہو کر کہا کہ اُمت کو ایک قراءت پر جمع کرنا چاہیے[۲]۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے صحیفے منگوائے اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ ان کی نقول تیار کریں۔ ان کی نت کے لئے صحابہؓ کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا تاکہ نئے نسخوں میں ہلکا سا فرق بھی نہ آئے جو بعد میں اختلاف کی بڑی خلیج پیدا کر دے۔ قرآن حکیم کی نقلیں قریشی قراءت کے بموجب کی گئیں اور ہر صوبہ کے مرکز میں ایک ایک نسخہ بھیج دیا گیا۔ ایک نسخہ مدینہ میں رکھا گیا۔ یہ نسخے الگ الگ صحیفوں میں نہ تھے، بلکہ ایک جلد میں تھے۔ اس لئے مُصاحف کہلائے۔ مصاحف مُصحَف کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں صحیفوں کا مجموعہ[۳]۔ ان مصاحف کو آئندہ نسخوں کے لئے نظیر اور مثال کا کام دینا تھا، اس لئے انہیں المصاحفُ الائمہ[۴] (یعنی معیاری مصاحف) بھی کہتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورہ سے فرمان جاری کیا کہ قرآن کے نسخوں میں جہاں کہیں قراءت یا تفسیر وغیرہ کے بارے میں اندراج ہو گیے ہوں انہیں اچھی طرح سے میٹ دیا جائے تاکہ اختلاف کا کوئی امکان نہ رہے[۵]۔ حضرت عثمانؓ کی اسی پیش بینی کا ثمرہ ہے کہ آج قرآن حکیم میں اختلاف کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور یہ کتاب دنیا بھر میں ایک ہی رسم الخط اور لغت کے بموجب لکھی جاتی ہے۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ۔ ترمذی ابواب التفسیر [۲] البدایہ والنہایہ۔ [۳] لسان العرب [۴] البدایہ والنہایہ از ابن کثیر۔ [۵] بخاری باب جمع القرآن۔ ابن کثیر۔

حضرت عثمان رضؓ کو اس کارنامہ کی بنا پر جامعُ القرآن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جامع القرآن سے یہاں مُراد ہے:

قرآن کے صحیفوں کو (ایک قراءت کے ساتھ)
مُصْحَف میں جمع کرنے والا۔

رہی قرآن حکیم کی تالیف یعنی ترتیب وتدوین، تو یہ اللہ تعالیٰ کی منشاء اور ہدایت کے بموجب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں انجام پا چکی تھی اور لاکھوں حفّاظ کے سینوں میں اٹل طور پر محفوظ تھی۔

نقطے اور اِعراب

اِعراب سے مراد ہے حرف کی حرکت وسکون وغیرہ جن کا اظہار ضمّہ، فتحہ، کسرہ وغیرہ سے ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس زمانہ کے عربی رسم الخط کے بموجب ابتداءً نہ نقطے تھے، نہ اعراب۔ یہ پچاس ہجری کے بعد معرض وجود میں آئے۔ اعراب بھی پہلے نقطوں کی صورت میں تھے۔ دیگر نقطوں سے ممیّز کرنے کے لئے انہیں الگ سیاہی سے لکھا جاتا تھا[1]۔

نقطے اور اِعراب پہلے کس نے لگائے؟ جواب کے لئے تاریخ پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مختلف روایات[2] کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایجاد حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے شاگردِ رشید حضرت ابوالاسود دُؤلی رحؒ کے ذہن رسا کا ثمرہ ہے۔ ان کے شاگرد یحیٰی بن یَعمر رحؒ نے اس کارنامہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کا الگ الگ

---

[1] نزہۃ الالبّاء ابن الانباری [2] مثلاً دیکھو معجم الادباء یاقوت، تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔ اتقان نوع ۷۶، تہذیب التہذیب۔ کتابُ المصاحف سجستانی۔ ابن کثیر۔

کس قدر حصہ ہے۔ اس ضمن میں حسن بصریؒ کے علاوہ یحییٰ بن یعمرؒ کے شاگرد نصرؒ بن عاصم کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ فضیلت حضرت علیؓ کے سلسلۂ تلمذ سے وابستہ ہے اور اس میں ابو الاسود اور یحییٰ کو اولیت حاصل ہے۔

یہ اعزاز حجاج بن یوسف سے منسوب کرنا درست نہیں۔ حجاج میں یہ لیاقت ہی مفقود تھی۔ ذہبی نے اُسے حفّاظ میں جگہ نہیں دی۔ اس کی فصاحت و بلاغت کی حکایات کے باوصف یاقوت نے اُسے اُدباء کی محفل سے باہر رکھا ہے۔ وہ قرآنِ حکیم کی تلاوت میں فاش غلطیاں کیا کرتا تھا۔ یحییٰ بن یعمرؒ نے گرفت کی تو حجاج نے انہیں اپنے صوبہ سے نکال دیا۔ حجاج بن یوسف کا خود اِعراب لگانا سرے سے خارج از بحث ہے۔ البتہ ابنِ خلّکان نے لکھا ہے کہ حجاج نے حکم دیا اور نصرؒ نے اِعراب لگائے۔ ابنِ خلّکان کی یہ اجنبی روایت تحقیق کی کسوٹی پر کھوٹی ثابت ہوتی ہے بالخصوص جب کہ نصرؒ کا بھی اس کام میں شریک ہونا بہ خوبی ثابت نہیں۔

اِعراب کو آخری شکل عبّاسی عہد میں ایک عالم خلیل بن احمد نے دی[1] جو آج تک قائم ہے۔

---

[1] اتقان نوع-۷۶

باب سوم

مضامینِ قرآن

دینِ کامل اور نعمتِ تمام

قرآن حکیم میں زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں بنیادی مضامین اور علوم دستیاب ہیں۔ یہ کتاب ایک کامل ضابطۂ حیات اور نصابِ زندگی ہے۔ احکام کے بارہ میں جب آخری آیت نازل ہوئی تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ۳) (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر دیا اور دینِ اسلام کو تمہارے لئے پسند فرمایا)

دین کے کامل ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے پورا سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہ دینِ کامل قرآنِ حکیم کے صفحات پر ثبت نظر آتا ہے۔ انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عظیم ترین اور کامل ترین نعمت تھی، لہٰذا فرمایا: وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو بار بار رحمت کے نام سے پکارا ہے۔

قرآنِ حکیم بحیثیتِ تذکرہ

قرآنِ حکیم میں بے شک حیات و کائنات سے متعلق سب بنیادی مضامین جمع ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے کہ قرآن محض ایک مرقعِ مضامین ہے اور بس۔ قرآن حکیم گلدستۂ کلام ہونے کے علاوہ دیگر گوناگوں صفات کا بھی

مالک ہے۔

قرآن حکیم میں اس کی صفات کے پیش نظر اس کے کئی نام آئے ہیں مثلاً: کلام، نور، موعظہ وغیرہ۔ ان میں ایک نام ایسا ہے جسے دیگر ناموں کے مقابلہ میں زیادہ اختصاص حاصل ہے، یہ نام تَذْکِرَہ ہے جو کئی جگہ حصر کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝

(ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ دکھ بھریں یہ تو صرف یاددہانی ہے اس کے لئے جو اللہ سے ڈرتا ہے)

اس کے علاوہ مندرجۂ ذیل مقامات پر بھی یہ لفظ حصر کے ساتھ آیا ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۹۰)

(یہ تو صرف یاددہانی ہے سب جہانوں کے لئے)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (ص۔ التکویر)

(یہ تو سب جہانوں کے لئے ذکر ہے)

قرآن کے مذکورہ مقامات میں ذِکْر اور تَذْکِرَہ کے لفظ قرآن حکیم کے منشاء اور نصب العین کو قطعیت کے ساتھ واضح کر رہے ہیں۔

فطرتِ انسانی کا بنیادی سبق توحید ہے۔ ازل کے روز جب اللہ تعالیٰ نے ارواح کو اکٹھا کیا تو ان سے پوچھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) ارواح بہ یک زبان بولیں: بَلٰى (کیوں نہیں!) یہ اقرارِ ربوبیت فطرتِ آدم میں شامل ہے۔ یہ روحِ انسانی کا درس اوّل ہے۔ یہی وہ توحید ہے جس کی عملی بجاآوری کے لئے انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریٰت ۵۱-۵۲)

(اور میں نے جن وانس کو فقط اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے)

دین وشریعت کے جس قدر احکام ہیں وہ سب اسی نصب العین کے حصول میں وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ اپنی اٹل اہمیت کے پیش نظر وہ بھی ثانوی نصب العین کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں جس طرح زنجیر کی کڑیاں زنجیر کے مقصد کے تحت بنائی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو زنجیر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر کڑی کی سالمیت ایک ثانوی مقصد بن جاتی ہے۔

انسان زندگی کی رغبتوں اور رنگینیوں میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ اپنے فطری درس یعنی توحید کو بارہا بھول جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم اس بھولے ہوئے سبق کی یاد جگاتا ہے۔ انسان کو ماسوا اللہ کے پھندوں سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی سمت پھیرتا ہے۔ قرآن حکیم ذکر اور تذکرہ بن کر لاشعور کے بھولے ہوئے درس کو شعور میں اجاگر کرتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تالیف الفوز الکبیر میں مضامینِ قرآنیہ کی تقسیم کرتے ہوئے قرآنِ حکیم کی تذکیر کو بہت اہمیت دی ہے۔ انہوں نے قرآنی علوم کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں تین شعبے یہ ہیں:

۱۔ تذکیر بآلاءِ اللہ: تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا۔ اور آلاءُ اللہ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں۔ تذکیر بآلاءِ اللہ سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذکر کے ساتھ زندگی کا سبق یاد دلانا۔

۲۔ تذکیر بایّامِ اللہ: ایامُ اللہ یعنی تاریخ کی مدد سے زندگی کا سبق یاد دلانا۔

۳۔ تذکیر بالآخرت۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ژرف نگاہی اور دقیقہ سنجی کا تقاضا تھا کہ انہوں نے

علومِ قرآنیہ کے پنجگانہ شعبوں میں سے تذکیر کے صرف تین شعبے خاص کر دیے ہیں ورنہ حق یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے سارے کے سارے پنجگانہ علوم کا آخری مقصد تذکیر ہی ہے۔

کامیاب تذکرہ کے لئے اس میں تین صفتوں کا ہونا ضروری ہے یعنی دل نشین (بلیغ) ہو، پسندِ خاطر (حَسَنہ) ہو اور ہر نوع کے انسانوں (عامۃ الناس) تک رسائی کرے۔ قرآنِ حکیم میں یہ تینوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اس تذکرہ کی تین حیثیتیں ٹھہریں، یعنی

(ا) تذکرۂ بلیغہ

(ب) تذکرۂ حَسَنہ

(ج) تذکرۂ عامّہ

ان میں سے ہر حیثیت پر ہم جداگانہ نگاہ ڈالیں گے۔

(ا) تذکرۂ بلیغہ: قرآنِ حکیم اپنے کو ذہن نشین کرانے یعنی بلاغ کی ضمانت بھی خود لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے کئی مضامین بلکہ عبارات کو بار بار لفظ بہ لفظ دہرا دیتا ہے۔ سورۂ زمر میں ارشاد ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (رکوع ۳) (اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایک یکساں کتاب ہے اور دُہرائی ہوئی باتیں ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے پوست اور دل اللہ کی یاد کی طرف ڈھلتے ہیں)

اس مفہوم کی قرآن مجید میں کچھ اور آیات بھی ہیں، مثلاً:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ — اور ہم نے اس قرآن میں بار بار اعادہ

لِيَذَّكَّرُوْا (بنی اسرائیل ع۵) کیا ہے تاکہ لوگ سبق اندوز ہوں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (الکہف ع ۸) اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے طرح طرح کی مثالیں بار بار بیان کیں۔

الغرض قرآن حکیم کے بلاغ کا ایک ذریعہ تکرار ہے۔ اس کے اور ذرائع بھی ہیں جن کے بدولت قرآن حکیم میں ایک عجیب تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو نہ صرف ذہن کو بلکہ جذبات کو بھی مسحور کر لیتی ہے۔ قرآن حکیم کا ایک ایک حرف دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے اور ایک ایک نس اسی کی روح سے معمور ہو جاتی ہے۔ قرآن کی صدا حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ بن کر شخصیت کا جزو بن جاتی ہے۔ یہی وہ حکمت بالغہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی نور، کبھی برہان (دلیل) کبھی فرقان (کسوٹی) اور کبھی بصائر (روشن دلائل) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے یہ مختلف نام اس کے تاثیری کرشمہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(ب) تذکرۂ حسنہ: سبق وہی کامیاب رہتا ہے جو دل پسند اور مرغوب طبع ہو۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں نکھارا ہے: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (اور ان کے ساتھ احسن طریقہ سے گفتگو کر) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ تین بار ارشاد فرمایا: عَلِّمُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔ (جامع بیان العلم ص ۶۵) (علم سکھاؤ اور آسانی پیدا کرو اور تنگی مت کرو)۔

قرآن حکیم کا اسلوب وادا نہایت دل نواز ہے۔ اذہان کا رخ غلط سمت سے موڑتا ہے لیکن چوٹ لگائے اور صدمہ دیے بغیر۔ ذہن اس سے ہوتے ہی اس کا فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ خوبی اس کو اَحْسَنُ الْحَدِيْث (الزمر ۲۳) یعنی بہترین کلام کا درجہ دیتی ہے۔

قرآن حکیم کے مضامین کا تجزیہ کر دیا ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک

اس پر جامع نگاہ ڈالو، ہر جگہ حُسن کا رنگ بکھرا اور نکھرا ہوا نظر آئے گا۔ اس میں ایک عجیب توازن، ہم آہنگی اور یک رنگی ہے جو خیالات اور جذبات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر اپنے موافق کر لیتی ہے۔ حُسن کا کمال یہی ہے۔ یہ کمال اس شان کے ساتھ کسی اور کتاب میں نہیں ملے گا۔

(ج) تذکرۂ عامہ: قرآن حکیم کی تذکیر کسی خاص طبقہ، وطن یا نسل تک محدود نہیں بلکہ یہ ذکرٌ للعٰلمین ہے۔ غریب و امیر، مالک و مملوک، بلند و پست، سیاہ و سفید، برنا و پیر، مرد و زن اور جن و انس سب کے لئے برابر کی ہدایت ہے۔ عقائد کو نہایت سادگی سے بیان کرتا ہے۔ فلسفہ و کلام کے کوئی پیچ نہیں۔ احکام کی حیثیت بنیادی اور اصولی ہے۔ اس لئے سادہ سے سادہ ذہن بھی انہیں قبول کر لیتا ہے۔ کہیں تاریخی روداد ہے تو جزوی سانحات کی گراں باریاں نہیں بلکہ صرف مختصر واقعات کا سادہ سا بیان ہے جس سے تاریخ کی کوئی فنی کتاب بے شک مرتب نہ ہو لیکن عبرت کے نقوش ذہن کی لوح پر مرتسم ہو جائیں۔

قرآن کے مضامین بجلی کی سرعت سے اذہان میں جگہ پاتے ہیں، اس کی عبارت دل پر قبضہ کرتی ہے، اسلوب رگوں میں تیر جاتا ہے اور آہنگ روح کو اسیرِ نشاط کرتی ہے۔ اس میں خاص و عام کی تفریق نہیں، سب پر برابر کا اثر ہوتا ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

قرآنی علوم کے سوتے کسی کو محروم نہیں کرتے۔ ایک عامی بھی قرآن حکیم کے بنیادی مضامین سے واقف ہو جائے تو جہالت کی مہلک گرفت سے نکل آتا ہے اور ناخواندہ ہونے کے باوجود علم کے حلقہ میں باریاب ہو جاتا ہے۔ ہر مومن صاحبِ علم ہوتا ہے چاہے اس کے علم کا درجہ کتنا ہی ابتدائی کیوں نہ ہو۔ قرآن حکیم میں علم کا لفظ

اگرچہ اس کے عام اور متعارف معنی میں آتا ہے لیکن بارہا ایمان کے معنی میں بھی آیا ہے۔ علم کے مقابل جہل کا لفظ ہے۔ جاہلیت کا لفظ قرآن میں غیر اسلام کے معنی دیتا ہے۔

مضامینِ قرآن کے چند خصائص

قرآن کا اول تا آخر غائر نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے مضامین کے چار ایسے خصائص نظر آتے ہیں جن کو ذہن نشین کئے بغیر قرآن میں درست طور سے تدبّر نہیں ہو سکتا۔ وہ خصائص یہ ہیں: (۱) جامعیت (۲) وحدت (۳) محکمیت (۴) تفصیل

ان خصائص پر اب ہم فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے۔

۱۔ جامعیّت: قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے۔ اس کے دو نام یعنی قرآن اور کتاب بھی اس وصف کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یوں تو بالعموم قرآن کے معنی پڑھنا اور کتاب کے معنی لکھنا لئے جاتے ہیں، لیکن ان میں ایک معنی مشترک بھی ہے اور وہ ہے: جمع کرنا۔ اس اعتبار سے قرآن کے ہم مادہ الفاظ مقرون اور قرین وغیرہ ہیں اور کتاب کے کتیبہ یعنی لشکر وغیرہ۔

قرآن حکیم کے مضامین ومطالب میں ایک آفاق گیر وسعت ہے۔ ہر قوم، ہر نسل اور ہر وطن کا انسان اس سے فیض اٹھا سکتا ہے جس طرح اسلام کسی محدود طبقہ یا خطہ کے لئے نہیں آیا اسی طرح قرآن کے فیوض بھی لسانی یا زمانی قیود میں بند نہیں۔ قرآنِ حکیم یہ اعلان کرتا ہے کہ سب انسان ایک اصل رکھتے ہیں اور نفسِ واحدہ سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ قرآن کا دامن ہر اس آدمی کے لئے فراخ ہے جو اس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا بتایا ہوا دین کسی گروہ کا اجارہ نہیں۔ یہ شاہراہِ حیات ہے جس پر چلنے کی صلائے عام ہے۔ ہر عمر، ہر

مزاج، ہر ذہن، ہر نسل، ہر قوم اور ہر وطن کا آدمی اس شاہراہ حیات کو اپنا سکتا ہے۔

قرآن حکیم سے قبل جس قدر الہامی کتب آئیں ان کی بنیادی اور اصولی تعلیمات اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ کل آسمانی صحیفوں کے حقائق قرآن میں اندوختہ اور محفوظ ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو سابقہ کتب مُنزّلہ کا مُہیمن یعنی پاسبان کہا ہے۔ اس حقیقت کو ایک آیت میں یوں بیان فرمایا ہے: وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (الشعراء ۱۹۶) (یہ پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا)

قرآن حکیم زندگی کے ہر پہلو کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ کتاب ان تمام اصول و قواعد اور ہدایات کی جامع ہے جو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے لابدی ہیں۔ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور بے عیب دستورِ زندگی ہے۔ ایمانیات، عبادات، معاملات غرضکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس کے لئے قرآن نے ہدایت کا سامان مہیا نہیں فرما دیا۔

قرآن حکیم کی جامعیت فقط اصول اور مبادی کے لحاظ سے ہے یعنی اس میں دین و شریعت کے بارے میں فقط اصولی اور بنیادی احکامات و معلومات ملتی ہیں۔ سرسری نگاہ کو شاید بعض جزئیات بھی نظر آجائیں لیکن یہ جزوی باتیں بھی اس لحاظ سے بنیادی حیثیت کی مالک ہیں کہ ان کے بغیر اصول کا سمجھنا ناممکن ہے۔

بعض لوگوں کو قرآنی جامعیت کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ کر کہ دنیا کی ہر چیز کا اس میں ذکر ہے اس کی آیات کی عجیب عجیب تفسیریں کرتے ہیں۔ ایسی تفسیریں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جن میں قرآنی آیات کو سائنس کے تمام جدید نظریات اور ایجادات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ یہ ضمانت دینا مشکل ہے کہ سائنس کے جو نظریات آج صحیح سمجھے جاتے ہیں وہ کل غلط ثابت نہیں ہوں گے۔

۲۔وحدت: وحدت کا تقاضا ہے کہ مکمل ہم آہنگی، یک جہتی، موزونیت اور موافقت ہو۔ قرآن حکیم میں یہ صفات بہ درجۂ کامل پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر ۲۳) کہا ہے یعنی اس کے مضامین میں مشابہت یا یکسانی ہے۔ ان میں تضاد، بے ربطی اور ناموزونی نہیں۔ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (فصیح قرآن ہے جس میں کجی نہیں) ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء ۸۲) یعنی قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے آتا تو اس میں بہت اختلاف ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن حکیم کے بارہ میں ارشاد ہے: وَلَا تَتَشَعَّبُ مَعَهُ الْاٰرَاءُ (اور اس کے ساتھ آراء میں افتراق پیدا نہیں ہوتا)۔ (بحر المحیط)

الغرض قرآن حکیم کے کل مضامین باہم دگر مربوط اور پیوست ہیں۔ ہر آیت دوسری آیت کی تائید اور توضیح کرتی ہے۔ قرآن ثابت کرتا ہے کہ فطرت و شریعت، دین و دنیا اور قانون و اخلاق ایک ہی حقیقت کے رخ ہیں۔ ان میں کوئی تضاد یا تباین نہیں۔

وحدتِ مضامین قرآن کی وہ خصوصیت ہے جس سے انکار کفر ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن کا ایک حصہ مان لیا اور ایک چھوڑ دیا۔ اگر اس کی ایک آیت بلکہ ایک حرف سے بھی انکار کیا جائے تو یہ کل قرآن سے کفر ہوگا۔ یہود کا تورات کے بارہ میں یہی شیوہ تھا۔ ان سے قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (البقرہ ۸۵)

(کیا تم کتاب کا ایک حصہ مانتے ہو اور ایک نہیں مانتے)

یہ روا نہیں کہ قرآن حکیم کی جو باتیں سرسری نظر میں پسند آجائیں ان کو تھام لیں اور جو طبع نازک پر گراں گزریں ان سے روگردانی کریں۔

مفسّر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس نکتہ کو ذہن میں رکھے اور علوم قرآن پر حاوی ہوئے بغیر تفسیر کی جرأت نہ کرے، ورنہ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں چند آدمیوں نے محاذِ جنگ پر شراب پی اور پکڑے گئے۔ انہوں نے عذر میں قرآن حکیم کی ایک آیت سے دلیل نکالنا چاہی کہ شراب کی اجازت ہے۔ انہیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا گیا اور وہاں تائب ہوئے۔ قرآن حکیم کے مضامین کی قطع و برید کر کے ان کو اس طرح الگ الگ کرنا کہ ایک مضمون دوسرے سے اوجھل ہو جائے نہایت گمراہ کُن حرکت ہے۔

مضامینِ قرآن کی وحدت نہ صرف شخصی زندگی کے توازن اور اعتدال کو پیشِ نگاہ رکھتی ہے بلکہ اس کے سامنے تمام نسلِ انسانی بلکہ کل کائنات کی وحدت ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک نظام میں پرویا ہوا ہے اور ہر ذرہ دوسرے ذرے پر کسی نہ کسی طور سے اثر انداز ہے ع

لہو خورشید کا ٹپکے جو ذرّے کا جگر چیریں

کوئی قوم کائنات کے اصولِ تکوینی سے انحراف کر کے تمکن اور استحکام نہیں پا سکتی۔ اگر یہ دیگر اقوام سے کٹ کر جدا رہنا چاہے تو ترقی کے جادہ پر گام زن نہیں ہو سکے گی۔ یہی حال افراد کا ہے۔ کوئی فرد یہ چاہے کہ وہ دیگر افراد یا اپنی قوم سے قطعِ تعلق کر لے تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ قدرت اس کو انسانیت کے زمرہ سے باہر پھینک دے گی۔ جماعت فرد سے قائم ہے اور فرد جماعت سے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمٰن ۳۱ : ۲۸)

(تم سب کا پیدا کرنا اور اٹھانا نفسِ واحد کی طرح ہے)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ الْجَمَاعَةِ (اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے) اور مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ

(جو شخص جماعت سے بیگانہ ہوا وہ آگ میں ڈالا گیا)

جس طرح فرد کی بہبود جماعت سے وابستہ ہے اسی طرح ہر جماعت کی بہبود دیگر جماعتوں اور ملتوں وابستہ ہوتی ہے جو قوم اپنے اندر سمٹنے کی کوشش کرے اس سے نشو ونما اور ارتقاء کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔

دنیا میں کسی قوم کی خوش حالی یا ترقی پذیری اس وقت تک دیرپا نہیں ہوتی جب تک وہ دیگر اقوام کو بھی ساتھ چلانے کی سعی نہ کرے۔ اعلیٰ وہ ہے جو دوسروں کو بھی اعلیٰ بنانے کی صلاحیت اور تڑپ رکھتا ہو۔ اَمر بِالمعروف اور نَہی عَنِ المُنکَر یعنی پسندیدہ بات کا حکم دینا اور ناپسند بات سے روکنا قرآن کا ایک بنیادی اصول ہے۔ کوئی مومن اس وقت تک کامل صاحب ایمان نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کو بھی صاحبِ ایمان بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنی میں خلافتِ ارضی کی اہل نہیں ہو سکتی جب تک وہ دیگر اقوام کو بھی اپنے اوطان میں خلافتِ ارضی کی اہل بنانے کی کوشش نہیں کرتی۔ استبداد، جبر و استحصال اور لوٹ کھسوٹ قرآن کے نظریۂ وحدت کے عین منافی ہیں۔

قرآن حکیم طبقاتی فتور اور گروہی بے اعتدالیوں کو مٹانے کا داعی ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرما ہونے کے بعد مدینہ کی مسلم اور غیر مسلم آبادیوں کو ایک معاہدہ میں شریک ہونے کی دعوت دی جس سے مقصود یہ تھا کہ مدینہ کے سب قبائل کو عدل و انصاف کی ایک سطح پر لایا جائے، طاقت کا توازن قائم ہو جائے اور شہر میں منافرت اور بد امنی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس وقت مدینہ میں جو یہود آباد تھے ان میں دو قبیلے بنو نضیر اور بنو قُریظہ نام بھی تھے۔ ان میں عدم مساوات کا یہ عالم تھا کہ بنو نضیر کا کوئی آدمی کسی قُرظی کے ہاتھوں مارا جاتا تو قاتل پورا خوں بہا ادا کرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی نضیری کسی قرظی کو مار ڈالتا تو وہ نصف خوں بہا ادا کرتا۔

اس قانونِ لاقانونی کی بنیاد یہ نظریہ تھا کہ بنونضیر کی زندگی کی قیمت بنو قریظہ سے دو چند ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے انصافی کو مٹایا۔ نضیری خون اور قرظی خون کی قیمت برابر قرار فرمائی۔

وحدتِ عالم کی یہ روح قرآن میں اول تا آخر جاری و ساری ہے۔ یہی وہ وحدت ہے جو بے عیب اور لاریب عدل کو جلوہ دیتی ہے۔

عدل کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا، برابر تقسیم کرنا۔ عدل وہ اصول ہے جس کے بل پر کائنات کا تمام کارخانہ چل رہا ہے۔ ہر شے ایک مقررہ مقدار میں ہے۔ کائنات کے سب اجزاء ایک مکمل توازن سے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم میزان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ (الشوریٰ ۱۷، الرحمٰن ۷ تا ۹) اگر اجزائے عالم میں ذرا بھی بے اعتدالی پیدا ہو جائے یا مقداروں میں غیر طبعی کمی بیشی ہو تو ہر ایک شے دوسری شے کے دائرۂ عمل میں داخل ہونے لگے۔ چاند سورج کے حلقہ میں در آئے اور سورج مریخ کی دنیا میں دخیل ہو جائے اور کائنات کا شیرازہ آناً فاناً بکھر جائے۔

کائنات کا عدل اور وحدت اس بات کے ضامن ہیں کہ اجزائے تکوینی میں پورا توافق اور تعاون ہو۔ سورج اگر اپنے دائرہ میں کارفرما ہے تو دیگر ستاروں اور سیاروں کے نظام میں منسلک ہو کر اور کائنات کے دستورِ اشتراک کا مطیع ہو کر۔ اللہ تعالیٰ نے ارض و سماوات کا جو نظام کارخانہ کر دیا ہے سب مخلوق اس پر بخوبہ مُو حل پیرا ہے۔ ہر شے نے اپنے کو طوعاً و کرہاً اس نظام کے سپرد کر دیا ہے۔ اس خود سپردگی کو قرآن حکیم اسلام کا نام دیتا ہے۔

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا (آل عمران ۸۳)

(آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناچاری سے اس کے تابع ہے)

انسانی بدن بھی عدل ہی کا مرہونِ منت ہے۔ قرآن حکیم میں انسان سے

ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِیۡمِ ۝ الَّذِیۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ (۸: انفطار) (اے انسان تو اپنے رب کریم سے کیوں بھٹک گیا جس نے تیری تخلیق کی، پھر تجھے ہموار ترکیب دی اور پھر تجھ میں عدل (توازن) قائم کیا)

انسان کی زندگی جبھی کامران اور سعادت مند ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کو کائنات سے ہم آہنگ کرے اور جس طرح کائنات کا ذرّہ ذرّہ حاکم مطلق کا بندۂ فرمان ہے اسی طرح انسان بھی حاکم مطلق کا مطیع و منقاد ہو جائے۔

قرآن حکیم عدل کے درس کو محض قانون کی دفعات پڑھانے اور سمجھانے میں محدود نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے وحدت کی روح پیدا کرتا ہے۔ روح اور مادہ کی وحدت، زمین اور افلاک کی وحدت، انسان اور کائنات کی وحدت، انسان اور انسان کی وحدت، فرد اور جماعت کی وحدت ——— الغرض تشتّت اور تحزّب کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں۔ اس کا اثر انسان پر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہنی اور جسمانی نظام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ فکر کے دوائر ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں۔ فکری انتشار اور ذہنی خلفشار معدوم ہو جاتے ہیں۔ انسان نہ صرف اپنا بلکہ ہر شے کا مقام و محل متعین کر لیتا ہے اور اس کی صحیح قدر و قیمت مشخص کر لیتا ہے۔ یہی وہ استعداد ہے جو انسان کو ظلم کرنے سے بچاتی ہے۔ ظلم کے بنیادی معنی ہیں؛ کسی چیز کو اس کے اصل محل سے بیگانہ جگہ میں رکھنا۔ ظلم محض ستم ڈھانے کا دوسرا نام نہیں بلکہ ایک وسیع المعنی لفظ ہے جو کج بینیوں، بدذوقیوں اور حد شکنیوں کی سب انواع کی اصل مشترک ہے۔ شرک بھی ظلم ہی کی ایک نوع ہے۔ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ (شرک ایک عظیم ظلم ہے)

ظلم وحدت کا حریف ہے۔ قوم یا فرد میں وحدت کا تصور جس قدر کمزور ہو گا وہ اسی قدر ظلم کی طرف زیادہ مائل ہو گی۔ قرآن حکیم کی تعلیمات میں اس قدر

ربط وضبط اور حسین اعتدال ہے کہ جو قوم اس روح سے معمور ہو جائے ظلم اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ وہ دنیا کے لئے سراپا رحمت ہو جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر اللہ کی رحمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ صدرِ اوّل کے مسلمان ایسے ہی تھے۔

۳۔ **محکمیّت**: حق کے لازمی عناصر میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ وہ پختہ اور محفوظ ہوتا ہے۔ باطل نہ اس پر غالب آسکے نہ اس میں راہ پا سکے۔ حق سرتا سر حق ہوتا ہے۔ وہ غیرِ حق سے کبھی آمیختہ اور ہم پیمان نہیں ہو سکتا۔ بقولِ اقبالؒ ع

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے

قرآن حکیم چونکہ حق ہے اس لئے نہ تو باطل کے زور کے آگے دبتا ہے، نہ اس کی گریہ مسکینی میں آتا ہے اور نہ اس کی زاہد فریب زلفوں کا اسیر ہوتا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حم السجدۃ ۴۱-۴۲) اور وہ یقیناً ایک غالب کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس میں داخل ہوتا ہے اور نہ پیچھے سے بحکمت والے اور حمد والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے)۔

مذکورہ آیات میں عزیز کا لفظ آیا ہے۔ عزیز کے درجِ ذیل معنی ہیں:

محبوب

بے مثال

غالب

یہاں عزیز سے مؤخر الذکر معنی مراد ہیں یعنی غالب۔ قرآنِ حکیم کی غالبیت کا راز اس کی ناقابلِ تردید پختگی اور استحکام میں ہے۔ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کر دی گئی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اَلْقُرْاٰنُ الْحَكِيْمُ،

اَلْکِتٰبُ الْحَکِیْمُ اور اللہ کو اَلْحَکِیْمُ وغیرہ کے صفاتی ناموں سے یاد کیا ہے۔ حکیم کے لغوی معنی ہیں:

(۱) پُر حکمت

(۲) محکم و مضبوط اور باطل سے محفوظ۔ وہ جس میں نقص یا خلل نہ ہو۔

سابقہ آسمانی صحائف میں بھی حق موجود تھا لیکن ان میں جو فرعی احکام تھے وہ فقط اسی زمانہ کے مناسب تھے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ صحیفوں کی مستقل تعلیمات محفوظ کر دی ہیں۔ پہلی کتابوں کی بعض تعلیمات وقتی اور ہنگامی تھیں اس لئے ان کی دائم حفاظت کی حاجت نہ تھی۔ لیکن قرآن حکیم چونکہ قیامت تک واجب العمل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی تاقیامت حفاظت کا عہد کیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

(یقیناً ہم نے ذکر یعنی قرآن نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ہیں)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت لفظاً و معناً دونوں طرح سے کی۔ اگر الفاظ محفوظ رہ جاتے اور معنی کا ثبوت نہ ملتا تو اس بے معنی حفاظت کا کیا فائدہ ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ اہتمام فرمایا کہ قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کو قیامت تک کے لئے ثابت و مسلّم کر دیا بلکہ اس کی پختہ بنیادی میں بھی فرق نہ آنے دیا۔ فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ (اس میں پختہ احکام ہیں) قیّم کے معنی ہیں خود قائم رہنے والا اور دوسروں کو قائم رکھنے والا۔ قرآن حکیم کے مضامین نہ صرف خود محکم ہیں بلکہ ہر اس شخص کی زندگی کو بھی محکم و استوار کر دیتے ہیں جو ان پر عمل پیرا ہو۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل ع ۱)

(یہ قرآن اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو درست ترین اور پختہ ترین ہے۔)

قرآن حکیم انسان کو محض لفظ و معنی تک محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس سے عملی

پیروی کا طالب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے لفظ و معنی کو عمل کا پیکر عطا کرنے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ارسال فرمایا تاکہ معنی کے سمجھنے میں کوئی کسر نہ رہے اور قرآنِ حکیم عملی صورت میں بھی تجلّی ریز ہو جائے۔ اگر عمل کی یہ تجلّی نہ ہوتی تو قرآن کی معنوی حفاظت ناتمام رہ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کی عملی تعبیر کو حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس میں قیامت تک کے لئے زندہ و پائندہ کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کے اجماعی عمل کو بھی قرآنی تعلیمات اور سنّتِ نبوی کا مظہر بنایا اور اس کے بعد آج تک ہر دور میں اہلِ اسلام کے کسی نہ کسی گروہ کو یہ توفیق عطا فرما دی کہ وہ قرآنی تعلیمات کی عملی حفاظت کرتا رہے۔

حدیثِ نبوی کی حفاظت صرف زبانی صورت سے نہیں ہوئی بلکہ جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی میں کتابی صورت میں بھی اس کی حفاظت کا آغاز ہو گیا۔

۴۔ تفصیل: قرآنِ حکیم کتابِ مفصل ہے جیسا کہ خود قرآنِ حکیم سے ثابت ہے:

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ (ھود-۱)

(یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات کو محکم کیا گیا اور پھر ان کی تفصیل کی گئی حکیم و خبیر کی طرف سے)

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (الانعام-۱۱۴)

(اور اللہ وہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب کو مفصل اتارا)

تفصیل پر بحث کرنے سے قبل یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اردو میں یہ لفظ ایک ایک جزو بیان کرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے لیکن قرآنِ حکیم میں یہ لفظ ان معنی کا حامل نہیں۔ اس کے لغوی معنی مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) فصل اور فرق دکھانا۔ جدا جدا کرنا۔ دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کر کے

ان کو ظاہر کرنا۔ ظن، التباس اور اشتباہ دور کرنا۔

(ب) تبیان یعنی کھول کر بیان کرنا۔ (بحر المحیط ۵ - ۲۰۰)

(ج) فصل کا لفظ قرآن وحدیث میں دوٹوک اور قطعی بات کے معنی میں بھی آیا ہے ۔

سورۃ الطارق میں ارشاد ہے : اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (یہ دوٹوک فیصلہ ہے۔ مزاح نہیں) ۔قولٌ فصلٌ سے مراد ہے حق وباطل اور درست ونادرست کے درمیان قطعی اور بے لاگ فیصلہ کرنے والا قول۔ قرآن حکیم ہدایت وضلالت میں صاف تفریق کردیتا ہے۔

حق صرف حق نہیں بلکہ حق الیقین[1] (یقینی حق) ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو اس طرح ذہن نشین ہونا چاہیے کہ شک یا شبہ کا سایہ تک نہ رہے۔ جس طرح اِلَّا اللّٰہ سے پہلے لَآ اِلٰہَ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح یقین سے پہلے لاریب کا ہونا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے قرآن حکیم کی ایک ایک آیت کو باطل سے ممتاز وممیز کرکے واشگاف اور روشن طور پر بیان فرمایا۔

کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۔ (حٰمٓ السجدۃ ۴)

(کتاب ہے جس کی آیات کی تفصیل کی گئی ہے۔ فصیح قرآن ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں)

سورۂ یوسف کی پہلی دو آیات میں ارشاد ہے :

الٓرٰ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۞ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ (یہ آیات ہیں کتاب کی جو واضح ہے اور واضح کرتی ہے۔ یقیناً ہم نے اُسے فصیح قرآن کے طور پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگ سمجھو)

---

[1] الحاقہ ۶۹ - ۵۱، الواقعہ ۵۶ - ۹۶

قرآنِ حکیم بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اس کے سب بیانات واضح اور واشگاف ہیں:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۸۹)

(اور ہم نے (اے نبیؐ) تیری طرف کتاب اتاری ہر بات کی وضاحت کرتی ہوئی)

مذکورۂ سابقہ آیات سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر شے کی تفصیل یعنی وضاحت ہے لیکن یہاں کُلِّ اَمْرٍ اور کُلِّ شَیْءٍ سے مراد زندگی یا کائنات کا ہر جزئیہ نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی امور ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم کے سامنے ساری کائنات کی بساط پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ اس کے بارے میں فقط اساسی احکام اور بنیادی اصول بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور اس کی مزید تشریح و توضیح پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور امتِ مسلمہ کے حوالے کر دیتا ہے ۔ امتِ مسلمہ قرآن اور حدیث کے احکام و بیانات پر قیاس کر کے زندگی کی تمام جزئیات کے بارے میں فیصلے کر سکتی ہے۔

قرآن و حدیث کے چراغ کی رہنمائی میں زندگی کا صحیح رستہ خود بخود متعین ہو سکتا ہے اور نہ اصول نہ جزئیات میں بشر کو کوئی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔

قرآن حکیم کے مضامین بے شک روشن و مُبرہن ہیں لیکن کن کے لئے؟ ان کے لئے جو سلیم اور حق جُو دل کے ساتھ اس کی طرف آتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۶ : ۱۲۶)

(ہم نے آیات کو کھول کر رکھ دیا ہے ان کے لئے جو عبرت پکڑتے ہیں)

جن اعدائے حق کے دلوں پر ضد اور تعصب کے تاریک غلاف چڑھے ہوئے ہوں وہ روحانی شپرہ ہوتے ہیں۔ قرآن کی روشنی میں وہ اور اندھے ہو جاتے ہیں۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ
اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَ
يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

(اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ گمراہ تو بدکاروں ہی کو کرتا ہے جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے شکستہ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں)۔

مضامینِ قرآن کی تقسیم

قرآن حکیم کے مضامین کی تقسیم کئی زاویوں سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک تقسیم خود قرآن حکیم نے محکم و متشابہ کے اعتبار سے کی ہے۔ متشابہ آیات وہ ہیں جن کے معنی فہم انسانی میں نہیں سما سکتے۔ ان کے علاوہ جو آیات ہیں وہ محکم ہیں۔ ایک تقسیم ناسخ و منسوخ کی رو سے ہے۔ بعض اصحابِ علم مضامینِ قرآنیہ کی تقسیم اخبار اور احکام (یا تکالیف) کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے قرآنِ حکیم کی اس آیت کو رکھتے ہیں: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا (تیرے رب کا کلمہ صدق اور عدل کے لحاظ سے کامل ہے) ان کا نظریہ ہے کہ صدق اِخبار کی طرف اشارہ کرتا ہے اور عدل احکام کی طرف۔

اگر مختلف عنوانات کے تحت مضامینِ قرآن کے ابواب قائم کرنا چاہیں تو دو صورت سے تقسیم ہو سکتی ہے یعنی:

ایمان و اسلام کی رُو سے

یا

علومِ پنجگانہ کی رُو سے

ان کی مختصر توضیح حسب ذیل ہے:

تقسیم اوّل ——— ایمان و اسلام کی رُو سے

بعض علماء نے اپنے ترجمۂ قرآن کی تمہید میں مضامینِ قرآن کی تبویب کر دی ہے بلکہ ایک صاحب نے تبویب القرآن کے نام سے ایک مستقل تالیف بھی کی ہے جس میں قرآن کی کل آیات کو مختلف عنوانوں کے تحت مدوّن کر دیا ہے۔ ان سطور پر جو تقسیم کی جائے وہ سادہ اور قریب الفہم ہوتی ہے اور عام اذہان سے مناسبت رکھتی ہے اسی انداز پر ذیل میں قرآنِ حکیم کی ایک مختصر تبویب درج کی جاتی ہے۔

ایمان

ایمان کی حقیقت، اجزائے ایمان

توحید (آلاءُ اللہ، ردِّ شرک، ردِّ نفاق، مخاصمات وغیرہ)

ملائکہ (ملائکہ کی ماہیت، ان کے فرائض، بعض بڑے ملائکہ کا ذکر)

کتبِ ربّانی (صُحُفِ آسمانی کی اہمیت، صحفِ سابقہ کا بیان، قرآنِ حکیم)

رُسُل (رسالت کی حقیقت، رسول کی صفات اور فرائض، اتباع الرسول، قصص الانبیاء)

آخرت (موت، برزخ، قیامت، حشر و نشر، میزان، دوزخ، جنت وغیرہ)

اِسلام

اسلام کی حقیقت، احکام و تکلیفات (عبادات اور متفرق اعمال)

ارکانِ اسلام (۱) کلمۂ طیبہ

(۲) صلوٰۃ (طہارت، وضو، غسل، تیمم، مساجد، قبلہ، رکوع وغیرہ)

(۳) زکوٰۃ

- (۴) صیام (رمضان، لیلۃ القدر، سحور، اِفطار، آداب صیام، اعتکاف وغیرہ)

(۵) حج (رسوم حج و عمرہ، فضائل حج وغیرہ)

تدبیرِ منزل: نکاح، تعددِ ازواج، مہر، طلاق

لعان، ظِہار، خُلع، رجعت

عِدت، نفقہ وغیرہ

وصیت، وراثت

حقوق و فرائض (عامۃ المسلمین، مرد، عورت، زوجین، والدین، اولاد، رضاع، تربیت، یتامیٰ، غلام، خدام، اولوا القربیٰ، ہمسایہ، غیر مسلم، مہمان، سائل، مساکین وغیرہ)

تبنیٰ

معاملات (کاروبار اور تعاون):

بیوع (خرید و فروخت، مبادلات، ماپ تول، رہن، سود)

امانت، قرض

عہود (ایمان، بیعت، مکاتبت وغیرہ)

شہادت (گواہی)

سیاستِ مُدُن (شہریت اور تمدن کا حفظان)

عدل، حکم و قضا

حدود و تعزیرات (قصاص، سرقہ، زنا، قذف، خمر)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی قولی اور عملی تبلیغ

ر جہاد : ہجرت ، غزوات ، شہادت ، فئے ، غنیمت

آداب معیشت : حلّت و حرمت ، پردہ ، استئذان

فضائل : مساوات ، صدق ، دیانت ، تقویٰ ، احسان ، شکر ، صبر وغیرہ

رذائل : سرگوشی ، بدگمانی ، بخل وغیرہ

تقسیم دوم ———— علوم پنجگانہ کی رُو سے

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصنیف الفوز الکبیر میں مضامین قرآن کو پانچ علوم میں تقسیم فرمایا ہے۔ آپ نے نہایت دقّت اور بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی مرتب کردہ تقسیم مضامین کو وہی اصحاب آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جن کی ذہنی سطح مقابلۃً بلند ہے اور علم دین کا فنّی مطالعہ رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے بجائے مضامین کے علوم کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ علم کا لفظ مضمون کے مقابلہ میں بہت وسیع ہے۔ مضمون محدود ہوتا ہے۔ مضمون کی وسعت بڑھ جائے اور ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لے تو علم کہلانے لگتا ہے۔ نیز علم خاص اور عام معنی میں بھی رائج ہے۔ بہت سے علوم جمع ہو کر ایک علم کو ترکیب دیتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے نزدیک قرآن حکیم کے علوم پنجگانہ مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ تذکیر بآلاء اللہ

۲۔ تذکیر بایام اللہ

۳۔ تذکیر بالآخرت

۴۔ مخاصمات (یا علم الکلام)

۵۔ احکام (یا علم فقہ)

تذکیر کے لغوی معنی ہیں: یاد دلانا۔ یہاں تذکیر سے مراد ہے انسان کو اس کی فطرتِ اصلیہ کا سبق یاد دلانا۔ آیاتِ تذکیر کا مقصود فطرتِ انسانیہ کی تنبیہ ہے کہ اگر وہ توحید کا ازلی سبق بھول چکی ہو تو اسے اس فراموشی کا احساس دلا کر توحید کا "مُقِر" بنایا جائے۔ ان آیات کی روح کفر کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ آیاتِ مخاصمات کے مخاطب وہ گروہ ہیں جو توحید پرستی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ انہوں نے دانستہ یا نادانستہ اپنے عقائد کو اس حد تک بگاڑ لیا ہے کہ انہیں توحید سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ آیاتِ احکام کا تعلق اعمال سے ہے۔

علومِ پنجگانہ کی جداگانہ تشریح درج ذیل ہے:

۱۔ تذکیر بآلاءِ اللہ: آلاءُ اللہ کے معنی ہیں: اللہ کی قدرت کی نشانیاں۔ تذکیر بآلاء اللہ سے مراد ہے انسان کو قدرتِ الٰہی کی علامات و آثار کے ذریعے زندگی کا سبق یاد دلانا۔

آلاء کے معنی نعمتیں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عجائبِ قدرت میں جو شے بھی ہے وہ انسان کے لئے نعمتوں کا مخزن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں صرف انہی عجائب اور نعمات کا ذکر کیا ہے جو سادہ عوام کے بھی، چاہے وہ شہری ہوں یا دیہاتی، علم میں ہوتی ہیں اور وہ بہ آسانی ان سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ وہ آلاء جو عوام کی رسائی سے دور ہوتی ہیں یا جن کو ذہن نشین کرانے کے لئے علم الکلام کی نکتہ پروری اور دقیقہ سنجی کی ضرورت ہو ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

تذکیر بآلاء اللہ میں سرِفہرست صفاتِ الٰہی کا بیان ہے۔ اپنی صفات کو اذہان کے قریب لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کی کچھ قابلِ مدح صفات کو

گیا ہے لیکن بہت گہرے معانی اور اس تنبیہ کے ساتھ کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (اس کے مانند کوئی شے نہیں)۔ (۴۲ : ۱۱)

اللہ تعالیٰ کی آلاء میں سب سے نافع جو چیز نظر آتی ہے وہ وحی والہام ہے جس کی روشنی میں انسان کو معرفتِ ربوبیت اور تزکیۂ روح کی راہ ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ زمین اور آسمانوں کی تخلیق کی طرف بار بار انسان کی توجہ دلاتا ہے اور اسے مطالعۂ کائنات کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ بساطِ قدرت کی نیرنگیوں اور اللہ تعالیٰ کی بندہ نوازیوں سے متاثر ہو کر اسی کی ذات کے آگے سراپا نیاز ہو جائے۔
اللہ تعالیٰ کی انسان پر یہ کس قدر عظیم نعمت ہے کہ کائنات کو اس کے لئے تسخیر کر دیا وہ اپنے بندوں کو بار بار یہ احسانات یاد دلاتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے رزق کا وافر سامان مہیا کر دیا ہے، زمین کے سارے خزانے تمہارے لئے وقف کر رکھے ہیں، آسمان سے بارش برساتا ہوں، دریا بہاتا ہوں، باغ اور کھیت سیراب کرتا ہوں، غلہ اور پھل کے ذخیرے فراہم کرتا ہوں، تمہارے لئے دن کی روشنی اور رات کا سکون بنایا، سواری اور ہل جوتنے کے لئے جانور پیدا کئے، سمندر پر کشتیاں رواں کیں، اور پہاڑوں میں معدنیات رکھ دیں۔

۲۔ **تذکیر بایامِ اللہ**: ایامُ اللہ کے معنی ہیں: تاریخی وقائع۔ قرآن کے تاریخی وقائع کو بالعموم قِصَص کا نام دیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں صرف انہی واقعات کو لیا گیا ہے جو عربوں میں پشت بہ پشت مشہور تھے۔ مثلاً حضرتِ آدم، حضرتِ ابراہیم، حضرتِ اسماعیل، حضرتِ اسحاق، حضرتِ یوسف، حضرتِ موسیٰ وغیرہ انبیاء علیہم السلام کے حالات، عاد و ثمود اور بنو اسرائیل وغیرہ کا عروج و زوال، طوفانِ نوح علیہ السلام، اصحابِ فیل وغیرہ کے قصے۔ ان قصوں کا ذکر نہیں آیا جو عربوں میں غیر مانوس تھے۔

یہ واقعات افسانہ سرائی کی غرض سے بیان نہیں فرمائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ قارئین کو عبرت ہو۔ ان اقوام کی تقلید کریں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے آگے عبودیت کا سر جھکایا، اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں اور اس کے انعام و اکرام کی سزاوار ہوئیں۔ اُن اقوام کی روش سے اجتناب کریں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرکے اس کے قہر کو دعوت دی۔ اِن قصوں کی مدد سے عقائد، اخلاق اور معاملات وغیرہ کے بارہ میں تعلیمات ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

اِن واقعات کی صرف اہم اور مفید مطلب کڑیوں کو لیا گیا ہے۔ تاثیر بڑھانے کے لئے بعض واقعات کو دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ کسی روداد کو شرح و بسط سے نہیں پھیلایا۔ اگر عام قصہ کہانی یا ناول کی طرح طولِ کلام یا رنگین بیانی سے کام لیا جاتا تو سننے والا لطف اندوزی میں اس قدر کھو جاتا کہ مقصودِ اصلی یعنی عبرت پذیری سے محروم رہ جاتا۔

۳۔ تذکیر بالآخرت: قرآن حکیم کے صفحات میں موت، قیامت اور اس کے بعد کے مراحل یعنی حشر و نشر، یوم الدین، جہنم اور جنت وغیرہ کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے جس سے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ان مضامین کو مختلف سورتوں کے اسلوب کی مناسبت سے کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ قیامت اور دوزخ کا نقشہ ایسی عبارات میں سمویا ہے جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گناہوں سے وحشت ہوتی ہے۔ جنت کے ذکر میں وہ دل آویزی ہے کہ دنیا کی لذتیں اور آسائشیں ہیچ نظر آتی ہیں۔

۴۔ مخاصمات: فریقِ مخالف کو قائل کرنے کے لئے دلائل کے ساتھ کلام کرنے کو مخاصمہ کہتے ہیں۔ علم الکلام کا یہی موضوع ہے۔

قرآنِ حکیم کے مخاصمات کا رخ چار بڑے گروہوں کی طرف ہے: مشرکین، یہود،

نصاریٰ، منافقین۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے عرب میں اس وقت یہ چار بر خود غلط گروہ تھے جو بزعمِ خویش راہِ ہدایت پر گامزن تھے۔ ان میں سے ہر ایک گروہ کا دعوی تھا کہ ہم ہی حضرت ابراہیمؑ کے پیرو ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کو واشگاف اور پُر زور الفاظ میں بتایا کہ تم گمراہی کی وادیوں میں سر پٹک رہے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کا دین وہی تھا جو آج اسلام کی صورت میں نئی سج دھج کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ تم نے اپنے دین کو مسخ کر ڈالا اور شرک کے رسوم و عقائد گھڑ لئے۔ تورات اور انجیل کو ان کے پیرووں نے دبیز پردوں میں ڈھانپ دیا مثلاً اصل عبارت مٹا ڈالی یا بدل دی یا اس کی تاویل فاسد کی یعنی اسے اپنے ڈھنگ کے غیر مشروع معنی پہنائے جن کا انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے کوئی ربط نہیں۔ کئی عبارتوں کو منسوخ العمل قرار دیا کہ اب ان کا دور گذر چکا۔

۱ مشرکین اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے لیکن اور بھی کئی خداؤں کو مانتے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں مستقل بالذات شریک ٹھہرایا تھا یا اللہ تعالیٰ کی صفات کی انسانی صفات سے اس رنگ سے تشبیہ کی، گویا دونوں کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں اور اور اللہ تعالیٰ بھی جسم اور مکان کا پابند ہے۔ یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ بلکہ حضرت موسیٰؑ کو بھی مانتے تھے لیکن ان کے ساتھ صفاتِ بشریہ منسوب کرنے کو تیار نہ تھے اور ان کی حقیقت کے بارہ میں عجیب و غریب اوہام گھڑ لئے تھے۔ اس کے علاوہ حشر و نشر سے بھی انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خاک میں مل جانے کے بعد ہم دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے۔ مجوس بھی مشرکین میں شمار ہوں گے۔

۲ یہود کی گمراہی کا سرچشمہ تحریف تھی۔ انہوں نے تورات کی لفظی اور معنوی تحریف کر لی تھی۔ ان کا زعم تھا کہ یہودیت ہی آخری مذہب ہے۔ یہود اللہ تعالیٰ کے مقرب اور محبوب بندے ہیں۔ ان کو دیگر اقوام پر نسلی تفوق حاصل ہے۔ یہود کے اعمال نہایت مکروہ تھے۔ از بس بخیل، حریص، سنگدل اور دغا باز تھے۔

۳
نصاریٰ کی ضلالت کی بناء تثلیث ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قائل ہیں لیکن اس تصور کے ساتھ کہ اللہ تین اُقنُوم ہے: اللہ، بیٹا اور روحُ القدُس۔ وہ حضرتِ عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور ان کے بارہ میں دور از کار عقائد رکھتے ہیں۔

۴
منافقین کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک تو اعتقادی منافق ہوتے ہیں جو دانستہ کافر ہوتے ہوئے اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا غیر مسلموں میں بدترین درجہ ہے۔ وہ جہنم کے پاتال میں ہوں گے۔ دوسری قسم کے منافق وہ ہوتے ہیں جنہیں عملی منافق کہا جاتا ہے۔ ان کا نفاق اعتقادی لحاظ سے نہیں بلکہ اخلاقی اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی وہ گروہ ہے جس کے بارہ میں قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ ان کے دل میں مرض ہے۔ ان کا ایمان مذبذب رہتا ہے۔

۵۔ احکام: احکام سے غرض اعمال کی اصلاح و ترقی ہے۔ احکام کے ذیل میں اوامر و نواہی آتے ہیں۔ اوامر جمع ہے امر کی جس کے معنی ہیں کام کرنے کا حکم اور نواہی جمع ہے نہی کی جس کے معنی ہیں ممانعت۔ ان کی تقسیم فرض، واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

قرآنی احکام مجمل ہیں۔ ان کی تفصیل جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ مثلاً قرآن کا حکم ہے کہ نماز قائم کرو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی توضیح فرمائی اور نماز کے بارہ میں مفصل ہدایات ارشاد فرمائیں۔

قرآنِ حکیم کے بعض احکام عام طرزِ خطاب سے ہیں اور بعض اشارۃً آتے ہیں۔ مثلاً اہلِ ایمان کے کسی کام کی تعریف کی تو مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ غیر مسلموں کو کسی بات پر زجر کیا ہے تو اس میں ایک اشارہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام اس سے پرہیز کریں۔

حضرتِ شاہ ولی اللہؒ نے احکام کی ایک مختصر فہرست دی ہے جس کو نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں، کیونکہ احکام کی مفصل فہرست سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

باب چہارم

قرآنِ حکیم کی اہمیت

قرآنِ حکیم کی اہمیت متعدد لحاظ سے ہے۔ مثلاً

۱۔ عقلِ انسانی کی دستگیری

انسانی خرد بہت محدود ہے۔ کامل اور بے خطا حکمت فقط اللہ تعالیٰ کی ہے۔ بشر کی عقل کامل ہوتی تو وہ کبھی غلطی نہ کرتا، لیکن زیرک ترین اشخاص بھی لغزش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حضرتِ انسان آج تک اپنے لئے از خود مکمل ضابطۂ حیات نہیں بنا سکا۔ بارہا اس نے زندگی کے میدان میں ایسی ٹھوکریں کھائیں کہ سر کے بل گرا۔ تمام کی تمام اقوام بعض دفعہ اپنے ہاتھوں یوں تباہ ہوئیں کہ زیادہ سے زیادہ ان کے نام رہ گئے یا دھندلے نشان۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام سے سابقہ ادوار میں بھی اقوام و مِلَل کو اپنی ہدایت سے نوازا تاکہ وہ زندگی کی صحیح راہ پر رواں ہوں۔ لیکن ہر قوم نے جلد یا بدیر تعلیماتِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا۔ الہامی کتابیں نسیاً منسیاً ہو گئیں، یا ان کی عبارت میں انسانی ہاتھ نے اس حد تک کارگزاری کی کہ اصلیت چھپ کر رہ گئی۔

آخر کار قرآنِ حکیم نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا اور اسے مستقبل کے تمام ازمان و اقوام کے لئے ایک ناقابلِ تغیر ضابطۂ حیات قرار دیا۔ اس کی تعلیمات قیامت تک قابلِ عمل ہیں۔ جو قوم اس دستورِ زندگی پر کاربند ہوگی، اس

صلاح و فلاح کی راہیں از خود کشادہ ہو جائیں گی۔ اس کتابِ حکیم کی یہ بنیادی اہمیت ہے۔

۲۔ دُنیائے غیب سے تعارف

کائنات کے دو شعبے ہیں: عالمِ شہود اور عالمِ غیب۔
عالمِ شہود ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کی زد میں آسکتا ہے۔ عالمِ غیب ہمارے حواس کی دسترس سے بہت دور ہے۔

کامیاب زندگی کے لئے جہاں عالمِ شہود سے بیش تریں آگاہی کی ضرورت ہے، وہاں عالمِ غیب سے بھی حسبِ ضرورت واقفیت لازمی ہے۔ ورنہ ہماری زندگی یکسر مادی اور مشینی زندگی ہو کر رہ جائے گی۔

ہم غیب کا علم اپنی کوششوں سے حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہم وحیِ الٰہی کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری اس حاجت کو قرآنِ حکیم میں روا کر دیا ہے۔ توحید ملائکہ، روح اور آخرت وغیرہ کے بارہ میں بعض بنیادی معلومات ہم پہنچا دی ہیں جن کے بغیر ہمارے عقاید یقیناً گمراہ ہوتے۔

۳۔ تعمیرِ حیات کی تعلیم نظائر کی روشنی میں

فنِ تعلیم کا متفقہ اصول ہے کہ درس وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے جس میں زبانی تقریر کے علاوہ ٹھوس نمونہ یا مثال بھی پیشِ نگاہ آجائے۔ قرآنِ حکیم نے صالح زندگی بسر کرنے کی تعلیم اسی طریقہ سے دی ہے۔

قرآنِ حکیم میں بعض انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کے اہم واقعات اور ابواب بیان ہیں۔ یہ ہمارے لئے نہایت گراں بہا اسباق مہیا کرتے ہیں اور عزم و ہمت کے ولولے پیدا کرتے ہیں[1]۔ تاہم ایک ایسی نظیر کی بھی ضرورت تھی جو ہر پہلو سے انسانیت

---

[1] ھود ۱۲۰: وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ (۱۱: ۱۲۰)

کا اکمل و احسن نمونہ ہو۔ اور جس کی زندگی میں انسانیتِ کاملہ کے تمام عناصر اور جہات اس توازن اور خوش اسلوبی سے باہم پیوست اور مربوط ہوں کہ قیامت تک کاروانِ حیات کی بے خطار ہبری کر سکے۔ یہ نظیر وہی ہستی پیش کر سکتی تھی جو قرآن کی عملی تعبیر ہو۔ اسے اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پیکرِ مبارک میں دنیا کے سامنے جلوہ گر کر دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ مجسّم تھے۔ کتاب اللہ نے آپ کی حیاتِ کاملہ کو اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (بہترین نمونہ) قرار دے کر اس کے اتباع کا بار بار حکم دیا ہے۔ آپؐ کی زندگی کی کچھ جھلکیاں قرآنِ حکیم میں نظر آتی ہیں، لیکن اس کے مکمل مشاہدہ کے لئے حدیثِ نبوی کا مطالعہ لابدی ہے۔

۴۔ رُوحانی بالیدگی کا سامان

قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم اللہ تعالیٰ کو اپنے سے ہم کلام پاتے ہیں۔ ایک سرخوشی اور نشاط پیدا ہوتی ہے۔ سفلی جذبات کی زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتی ہیں اور روح بلندی کی طرف بال کشا ہوتی ہے۔

۵۔ عزم و یقین کا مخزن

قرآنِ حکیم کا ایک سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو یہ یقین رہ رہ کر دل نشین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر لحظہ حق پرستوں کی دستگیر اور پشتیبان رہتی ہے۔ وہ دنیا میں کبھی بے آبرو نہیں ہوتے۔ قرآنِ حکیم بے دلی، مایوسی اور تذبذب کو مٹا کر عزم کی پختگی اور ارادہ کی سنگینی عطا کرتا ہے۔

۶۔ صداقتِ اسلام کی دلیل

قرآن ایک لاریب کتاب ہے۔ پیروانِ اسلام کے ہاتھوں میں یہ ایک زندہ و پائندہ معجزہ ہے۔ ہم اس کی بے لاگ صداقت اور حیرت انگیز معجزیت کی مدد سے اسلام کے بڑے بڑے زبان آور نکتہ چینوں کا منہ بند کر سکتے ہیں۔

۷۔ آزادیِ ضمیر کا چارٹر

قرآنِ حکیم ضمیر کی آزادی کا ضامن ہے۔ دین کے معاملہ میں بھی یہ آوازِ بلند کہتا ہے ؛ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین میں کوئی جبر نہیں) اسلام تبدیلِ مذہب میں شمشیر سے کام نہیں لیتا۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو مساویانہ اور برادرانہ سلوک رہا ہے، آج تک کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکی۔

۸۔ عالمگیر برادری کی دعوت

قرآنِ حکیم ایک عالمگیر اور محبت افروز اخوت کی طرح ڈالتا ہے۔ بے شک قرآن کا یہ دوٹوک اعلان ہے کہ صحیح دین فقط دینِ اسلام ہے۔ لیکن اپنے پیروؤں کو کسی انسان سے مفت کی نفرت اور عداوت نہیں کرنے دیتا، بلکہ انہیں امن، سلامتی اور مروت و رواداری کا نقیب بننے کا حکم دیتا ہے۔

۹۔ چراغِ عقل کا پاسبان

قرآنِ حکیم اس حقیقت کو ضرور بے نقاب کرتا ہے کہ بنی آدم کی عقل محدود ہے لیکن مدعا یہ نہیں کہ انسان فکر و تدبر کی صلاحیتوں سے دست بردار ہو جائے۔ قرآن

کی نگاہ میں عقل انسانیت کا ایک انمول جوہر ہے، البتہ اس قابل نہیں کہ حکمتِ الٰہی کے آگے صف آرا ہو سکے۔

ربِّ حکیم نہ صرف قرآن کی آیات میں بلکہ ارض وسماوات کی کارگاہ میں بھی فکر و تدبر کی پکار پکار کر دعوت دیتا ہے۔ تسخیر کائنات کے کتنے ہی راز ہیں جو قرآنی آیات میں واشگاف نظر آتے ہیں بشرطیکہ نگاہ میں جستجو کا سوز ہو۔

قرآن کی اسی دعوت وارشاد کا فیض تھا کہ وہ عرب جن کی ظلمت بہ دوش دُنیا میں اسلام سے قبل نورِ علم کی ایک کرن کا گذر بھی نہیں ہوا تھا اچانک سائنس اور طبیعی علوم کے میدانوں میں وہ یکہ تازیاں کرتے نظر آئے کہ دنیا انگشت بہ دنداں رہ گئی۔ عرب کے باشندوں کو کاغذ اور قلم کے استعمال سے اگر آگاہی تھی بھی تو برائے نام۔ لیکن قرآن کی پہلی ہی آیات نازل ہوئیں تو انہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے۔ اسلام جوں جوں پھیلا، نوشت وخواند کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا حتیٰ کہ فرزندانِ توحید علم کی رفعتوں پر چھا گئے۔ لیکن بدقسمتی سے بالآخر تن آسانی نے انہیں گھیر لیا، قرآنی تعلیمات سے غافل ہو گئے، علم کی زمام ان کے ہاتھوں سے نکل گئی اور علوم وفنون میں دیگروں کے دست نگر ہو گئے۔

بابِ پنجم

اعجاز القرآن

قرآن مجید ایک معجزہ ہے، اور معجزہ بھی وہ جو کئی معجزات کا جامع ہے۔ ان سب کا احاطہ ہماری فہم سے بالا ہے۔ البتہ چند معجزات ایسے ہیں کہ فوراً نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً حفاظتِ قرآن، اسلوبِ قرآن، پیش گوئیاں، اخلاقی تعلیمات، طبیعیاتی حقائق وغیرہ۔ ہم ان میں سے چند عنوانات پر الگ الگ بحث کریں گے۔

(الف) حفاظتِ قرآن

قرآنِ حکیم عرب کے ملک میں نازل ہوا جو اس وقت تہذیب و تمدن کے لحاظ سے تیرہ و تار تھا۔ جہالت کا گھر گھر ڈیرا تھا۔ چھاپہ خانہ تو مدتوں بعد کی ایجاد ہے، اس وقت کاغذ تک مشکل سے ملتا تھا۔ تاہم آج چودہ صدیاں گزر چلیں اور قرآنِ حکیم روزِ اوّل کی طرح سالم و محفوظ چلا آتا ہے۔ ایک حرف کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ دنیا میں اور کوئی کتاب نہیں جس کے بارہ میں یہ دعویٰ کیا جا سکے۔ ربِّ قدیر نے نہ صرف اپنی کتاب کو محفوظ رکھا بلکہ اس کی زبان کو بھی دستبردِ زمانہ سے مامون کر دیا۔ قرآن سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان کی زبانیں تک ناپید ہو چکی ہیں۔

(ب) اُسلوب

۱۔ قرآن اللہ کے جلال و جمال کا آئینہ دار ہے۔

ہر تحریر میں صاحبِ تحریر کی شخصیت کے خطوط مستور ہوتے ہیں۔ ایک عامی کی نگاہ چاہے ان تک نہ پہنچ سکے، لیکن ایک نکتہ دان اور صاحبِ نظر

نقاد تصنیف سے مصنّف کی مکمل شخصیت کو بھانپ جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی ایک ایک آیت زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ میں انسان کا نہیں، یزداں کا کلام ہوں۔ ہمارے ملک کے ایک ذہین نقاد پروفیسر سراج الدین فرماتے ہیں:

"قرآنِ کریم کے خدائی کلام ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے۔ کسی مقام پہ بھی اس دعویٰ کی تردید نہیں ہوتی۔ انگریزی شاعر ملٹن نے اپنے شاہکار میں خدا کا کردار ساخت کیا ہے۔ باوجودیکہ خود نابغۂ روزگار تھا لیکن چونکہ انسان تھا اور خاطی انسان تھا، وہ اپنے تخلیق کردہ خدائی کردار کو الوہیت کی معمولی سطح پر بھی قائم نہیں رکھ سکا۔ جگہ جگہ اس کے کردار سے ملٹن کی ذہنی بشریت اُبل اُبل کر بے نقاب ہوتی ہے۔ اگر عیسائی مستشرقین کے اعتراض میں ذرّہ بھر بھی علمیت ہوتی تو وہ قرآنِ حکیم میں بھی اس ضعف کی نشان دہی کر دیتے۔ لیکن چونکہ یہ خدا کا کلام ہے اس کی جلالی شان میں جھول نہیں پڑتا۔ اور یہی وہ ثبوت ہے جس کے آگے عیسائی معترضین سرنگوں ہیں۔"[1]

۲۔ اُسلوب قرآن کا تجزیہ محال ہے

قرآن نے جو اسلوب بیان پیش کیا ہے وہ انوکھا اور بے نظیر ہے۔ اس پیرایہ کا وجود نہ قرآن سے پہلے تھا اور نہ بعد کی کسی کتاب میں ہے، اس کی نہ کوئی نقل اتار سکا اور نہ تجزیہ کر سکا۔

---

[1] ہفت روزہ "چٹان" ۲۶ مئی ۱۹۵۸ء

قرآنِ حکیم کا اسلوبِ کلام تمام انواعِ اسلوب کا جامع ہے تاہم ان میں سے ایک بھی نہیں۔ شعر نہیں لیکن شعر کا جادو رکھتا ہے۔ خطابت نہیں لیکن خطابت کے جوش سے معمور ہے۔ نثر نہیں لیکن نثر کی تمکنت اور حُسنِ ادا کا سرمایہ دار ہے۔ الغرض کسی صنف میں بند نہیں لیکن ہر صنف کی خوبیوں اور رعنائیوں سے مالامال ہے۔ یہ پیرایۂ سخن دل پہ اثر کرتا ہے لیکن ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتا۔

۲- قرآن میں کوئی عیب یا ضعف نہیں

یہ وہ وصف ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اعلان فرمایا تو مشرکینِ عرب بھڑک اٹھے اور آپؐ کے خلاف تمام قوتیں صَرف کر ڈالیں۔ زر اور زور کا کوئی حیلہ نہ تھا جو اٹھا رکھا ہو لیکن دو چیزوں کے سامنے وہ عاجز اور دَم بخود ہو جاتے تھے: اوّل اسلوبِ قرآن اور دوم اخلاقِ نبوی۔

عرب والے اَن پڑھ ہونے کے باوجود فصاحت و بلاغت کی انتہائی بلندی پر تھے۔ دیگر اقوام کو اعجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ ان میں ایسے قادر الکلام شاعر اور خطیب اٹھے کہ آج تک ان کا لوہا مانا جاتا ہے۔ زبان و بیان کی ایک ایک رمز سے آگاہ تھے۔ اس لئے اسلوبِ بیان کا ان سے بڑھ کر اور کون نقّاد ہو سکتا تھا۔ مگر وہ اپنی فرعونیت کے باوجود قرآنِ حکیم کی ایک ایک آیت کے سامنے ساکت و صامت رہ جاتے تھے۔ عرب کے جس نامور شاعر کے کانوں میں قرآنِ حکیم کی آیات پڑیں اس نے بے ساختہ اقرار کیا کہ یہ الہامی کلام ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ہیں کہ مسلّم الثبوت شاعر قرآن سے متاثر ہو کر اسلام لائے اور آئندہ شعر گوئی کی جسارت نہ کی۔

۴- عبارت و معنی کا ربط

قرآن کے اسلوب اور معانی میں ایک حیرت انگیز ربط ہے۔ ان کا رشتہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ جو لفظ جہاں جو گیا ہے اُسے وہاں سے اٹھا کر دوسرا لفظ لاؤ تو معنویت جاتی رہے گی۔ کوئی نگارش ہو اس میں یہ خوبی جس قدر زیادہ ہوگی اسے اسی قدر بلند پاؤگے۔ قرآنِ حکیم میں یہ خوبی معجزہ کے درجہ میں ہے۔

قرآنِ حکیم میں مضامین کی بوقلمونی ہے۔ وعظ و پند، تاریخ، اخلاق، عبادات قانون۔ غرض نئے سے نئے مضامین ہیں، لیکن الفاظ نے ہر مضمون کا ساتھ دیا ہے۔

مضمون کی ہر نوع کو قرآنِ مجید نے یکساں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ طرّہ یہ کہ معانی کی اس رنگا رنگی کے باوجود ابتداء سے انتہا تک کوئی تفاوت نہیں بلکہ ایک لطیف ربط اور ہم آہنگی ہے۔

۵- معانی کی وسعت

قرآنِ حکیم کے الفاظ اور آیات از بس وسیع المعنی ہیں۔ ہر لفظ معانی و اسرار کا ایک معدن ہے جس کا سرمایہ ختم ہونے پر نہیں آتا۔ بعض علماء نے صرف بسم اللہ کی تفسیر میں صفحوں پر صفحے لکھ دیے ہیں لیکن تشریح کا حق ادا نہیں کر سکے۔

۶- ذہن کی ہر سطح کے موافق ہے

کلامِ مجید کے مطالب میں یہ خوبی ہے کہ عامی ہو یا عالم ہر درجہ اور ہر دَور کا انسان بقدرِ فہم اور حسبِ ضرورت مستفید ہو سکتا ہے۔ ایک عام شخص اپنی

ضرورت کے مناسب عقیدہ وعمل کی تعلیمات حاصل کر لیتا ہے۔ اور ایک عالم کو سیرابیٔ طبع کے لئے معنویت کے ابدی سرچشمے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

۷۔ حُسنِ صَوت

قرآنِ حکیم میں ایک وجد آور ترنم اور سحر انگیز زیر وبم ہے۔ پڑھنے یا سننے والا شخص ایک کیفیت میں سرشار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ عربی زبان سے ناآشنا ہیں اور مطلب نہیں سمجھتے وہ بھی آہنگ میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر خوش الحان قاری قرآن خوانی کرے تو چرند و پرند تک مسحور ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا یہ وصف اس کے حفظ کرنے میں بہت مدد دیتا ہے۔

۸۔ شیرینی

کلام ربانی کے حرف حرف میں شیرینی ہے۔ کوئی آیت ایسی نہیں جو طبیعت میں تلخی یا گرانی پیدا کرے۔ جہاں رحمت و مغفرت کے مژدے ہیں وہاں دل اٹکنا ہی چاہیے لیکن جن مقامات پر عصیاں کے نتائج کا خوف دلایا گیا ہے یا قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں بیان کی گئی ہیں وہاں بے شک دل پر ایک دہشت طاری ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی الفاظ کی حلاوت اور دل آویزی دامنِ دل کو تھامے لیتی ہے۔

۹۔ صفائی اور پاکیزگی

کلام مجید کی عبارت از بس مصفّا اور پاکیزہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو شُستگی اور شائستگی کے معیار سے فروتر ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے عزیزِ مصر کی بیوی کی محبت کا قصہ خاصا مفصّل ہے لیکن حیا کے آداب کسی مرحلہ میں

مجروح نہیں ہوتے۔

۱۰۔ دلفریب تکرار

قرآنِ حکیم کے بعض مقامات میں آیات کی لفظاً یا معناً تکرار نظر آتی ہے۔ یہ تکرار کسی اور کتاب میں ہوتی تو ذوق قبول نہ کرتا لیکن قرآنی عبارات کی تکرار اس قدر خوش آیند اور طبیعت نواز ہے کہ معنی و مفہوم کا نقش دل پر خوب جم جاتا ہے۔ ہر تکرار نئے مقصود اور تازہ تاثیر کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔

۱۱۔ اثر انگیزی اور حیات آفرینی

کسی تصنیف کی ایک کسوٹی یہ ہوتی ہے کہ وہ اذہان پر کس حد تک اپنا نقش بٹھاتی ہے۔ اگر وہ ایک صالح اور سود مند انقلاب پیدا کر جائے تو یہ اس کی کامیابی کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہوگا۔ قرآنِ حکیم میں یہ وصف بہ درجۂ اُتم موجود ہے۔ قرآن حکیم نے اپنی تاثیر سے سہ گونہ انقلاب پیدا کیا: روحانی، علمی اور عملی۔ یہ ایک صالح اور تعمیر انگیز انقلاب تھا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ عرب کی جاہل اور وحشی قوم چشم زدن میں علم و تمدن کے معراج پر پہنچ گئی۔ اس نے دیگر اقوام کو بھی روحانی، علمی اور عملی فیوض سے مالا مال کیا۔ قرآنِ حکیم کے اس تاریخی معجزہ کے دشمن بھی معترف ہیں۔

۱۲۔ قرآن فصاحت و بلاغت کے جوہر پیدا کرتا ہے

جن ہستیوں نے قرآنِ حکیم کو دل میں جگہ دی ان کا اپنا کلام بھی فصاحت و بلاغت کا نادر الوجود شاہکار ہو گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کو دیکھو۔ آپ

افصح العرب والعجم ہیں۔ زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ حکمت کا گنجینہ ہے۔ آپ کے صحابہ کرامؓ کے بعض خطبے اور تحریریں اب بھی محفوظ ہیں۔ وہ دل کشی اور معنی خیزی کے مرقعے ہیں۔ دیگر اقوام نے بھی بڑے بڑے فصحاء پیش کئے ہیں، ان کا کلام صحابہ کرامؓ کے کلام کے سامنے لاؤ تو فرق صاف نظر آجائے گا۔

۱۳۔ دُنیا قرآن کا جواب پیش نہیں کرسکی

آغازِ اسلام میں بعض دشمنوں نے کہا کہ (نعوذ باللہ) قرآن میں بھلا کیا رکھا ہے ایسی تحریر تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں۔ قرآن حکیم نے جواب میں للکار کر کہا: فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (اگر تم سچے ہو تو اس کے مانند ایک ہی سورۃ لاؤ اور اپنے حامیوں کو بلاؤ)۔ کسی سے جواب بن نہ پڑا۔ اعداء کی یہ لاجوابی آج تک باقی ہے۔ بعض جھوٹے نبی اُٹھے۔ انہیں جال پھیلانے کے لئے وحی اور الہام گھڑنے کی بھی سوجھی حسب توفیق کچھ فقرے تراش لئے لیکن ان کی حیثیت یاوہ گوئی سے بڑھ نہ سکی۔

ایک عیّار شخص مسیلمہ کذّاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نبوت کا عَلَم اٹھایا۔ اس نے وحی کا دعوٰی کیا۔ چند فقروں کا ترجمہ ملاحظہ ہو: اے دو مینڈکوں کے جوڑے کی جَنی ہوئی مینڈکی! تو جو صاف کرتی ہے سو صاف کرتی ہے تیرا بالائی حصہ پانی میں اور زیریں کیچڑ میں ہوتا ہے۔ نہ کسی پینے والے کو روکتی ہے اور نہ پانی گدلا کرتی ہے۔ ملک آدھا ہمارا اور آدھا قریش کا ہے۔ لیکن قریش ظالم ہیں۔

قرآنِ حکیم میں سورۃ العادیات ایک خوش آہنگ اور حقیقت آرا سورت ہے مسیلمہ کذاب نے اس کی طرز میں یوں طبع آزمائی کی:

وَالْمُبْدِیَاتِ زَرْعًا وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا وَالذَّارِیَاتِ قَمْحًا وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خُبْزًا وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا وَاللَّاقِمَاتِ لُقَمًا اِهَالَةً وَسَمْنًا لَقَدْ فُضِّلْتُمْ عَلٰی اَهْلِ الْوَبَرِ وَمَا سَبَقَکُمْ عَلٰی اَهْلِ الْمَدَرِ (سوگند ہے کھیتی بونے والیوں کی اور فصل کاٹنے والیوں کی اور گیہوں پھٹکنے والیوں کی اور پسائی کرنے والیوں کی اور آٹا گوندھنے والیوں کی اور روٹی پکانے والیوں کی اور ثرید بنانے والیوں کی اور گھی کے ساتھ پے در پے لقمے توڑنے والیوں کی اے میرے قبیلہ والو) تمہیں صحرا نشینوں پر فضیلت دی گئی ہے اور شہریوں پر تمہیں کیا ہی سبقت حاصل ہے)

حریف قوموں اور سلطنتوں نے قرآن کی آواز دبانے کے لئے کیا کیا زور نہیں مارا۔ لیکن قرآن کے مقابلہ پر کتاب لکھنے کی جرأت آج تک نہیں کر سکے۔

(ج) پیشگوئیاں

قرآنِ حکیم کی پیشگوئیوں کی معجزانہ صداقت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بعض ارشادات یہ ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۵:۹)	یقیناً ہم نے قرآنِ حکیم نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔
بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت ۲۹/۴۹)	بلکہ یہ قرآن واضح آیات (کی صورت میں) ہے جو علم والوں کے سینہ میں ہیں۔
لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ○ (حٰمٓ السجدہ ۴۲)	باطل اس کو نہ سامنے سے چھوئے گا اور نہ پیچھے سے۔ یہ حکیم و حمید اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

آیاتِ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں باطل راہ نہیں پائے گا اور سینہ بہ سینہ محفوظ رہے گا۔ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو چکی ہے۔

۲۔ ارشادِ الٰہی ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ (بنی اسرائیل ۸۸) (اے نبی! کہہ دیجئے کہ اگر جنّ و انس اکٹھے ہو کر قرآن کی مثال پیدا کرنے پر کمر بستہ ہو جائیں تو اس کی مثال نہیں لا سکیں گے چاہے ایک دوسرے کی خوب مدد کریں)

چودہ صدیاں بیت چلیں۔ یہ چیلنج بدستور فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ کسی حریف کو جسارت نہیں ہوئی کہ اسے قبول کرے۔

۳۔ ہجرت نبوی سے قبل رومی اور ایرانی سلطنتوں کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایران والے معرکے پر معرکہ سر کر رہے تھے۔ انہی ایام میں قرآنِ حکیم نے اعلان کیا کہ فتح روما والوں کی ہوگی۔ مشرکین کو اعتراض کا بہانہ مل گیا اور کہا کہ ایرانیوں کے غلبہ پر مہر لگ چکی ہے، اب پانسہ کیسے پلٹ سکتا ہے؟ لیکن تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ رومیوں نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔

۴۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ فرعون سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوا اور اس کا بدن اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھ لیا تاکہ آئندہ ادوار میں عبرت دلانے کا کام دے۔ اس دعوٰی کی صداقت حال ہی میں ثابت ہو گئی ہے۔ مصر میں بعض قدیم بادشاہوں کی لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کے بارہ میں محققین کا فیصلہ ہے کہ یہ اس فرعون کی لاش ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں غرقاب ہوا تھا۔

۵۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی طوفانِ آب کے اترنے کے بعد کوہِ جودی پر ٹک گئی۔ یہ پہاڑ ترکیہ میں ہے۔ حال ہی میں یہ کشتی دستیاب ہو گئی ہے۔ پہاڑ کی بلندی پر برف میں مدفون پڑی ہے۔

باب ششم

تفسیر

مفہوم: تفسیر کے لُغوی معنی ہیں: بیّن کرنا یا تشریح و توضیح کرنا۔ اصطلاح میں تفسیر سے مراد ہے: قرآنِ حکیم کی شرح۔

بعض عبارتیں ایک سے زائد مفہومات کا احتمال رکھتی ہیں۔ ایک تو ظاہری ہوتا ہے جو پہلی ہی نگاہ میں سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن مزید غور و فکر کیا جائے تو دیگر مفہوم بھی اُبھر آتے ہیں۔ انہیں باطنی مفہوم کہتے ہیں۔ ان میں سے کس کو اختیار کیا جائے؟ اس فیصلہ تک پہنچنے کے لئے دلائل سے مدد لی جاتی ہے۔

جب کسی دلیل کی رہنمائی میں لفظ یا عبارت کے ظاہر کو چھوڑ کر اس کے باطن کو اختیار کیا جائے تو اسے "تاویل" کہتے ہیں۔ تاویل کے لُغوی معنی ہیں پھیرنا یا لوٹانا۔ اصطلاحاً مراد یہ ہے کہ عبارت کا مطلب ظاہر سے باطن کی طرف پھیرا جائے۔ تاویل کی اصطلاح بہت وسیع ہے اور قرآن کے بتائے ہوئے ان سب لغوی معانی کو شامل ہے: بیان[1]۔ تعبیر[2]۔ اصل مدعا[3]۔ باطنی مفہوم[4]۔ حقیقت[5]۔ تحقیق[6]۔

قرآن میں تاویل کا لفظ عملی ثبوت[7] اور انجام[8] کے معنی میں بھی آیا ہے۔

---

[1] سورۂ یوسف ۱۰۰ [2] یوسف آیت ۳۶، ۴۴، ۴۵ وغیرہ [3] یوسف ۶ [4] الکہف ۱۸-۸۲ [5] یونس ۳۹ [6] النساء ۵۹ [7] الاعراف ۷، ۵۳ [8] یونس ۳۹ بنی اسرائیل ۳۵

"تاویل کا علم ایک بیش بہا ملکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو تاویل الاحادیث یعنی باتوں کی صحیح سمجھ اور تاویلِ رُؤیا یعنی خوابوں کی تعبیر کی اہلیت عطا فرمائی تھی، جس نے انہیں غلامی سے نکال کر مصر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جناب عبد اللہ بن عباسؓ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ انہیں (قرآن کی) تاویل کا علم عطا کر۔

"تاویل تفسیر کی ایک نوع ہے[1]" تاویل انتہائی احتیاط کی محتاج ہے جس کے بغیر یہ تفسیر کے دائرہ سے نکل کر اپچ کے زمرہ میں چلی جاتی ہے اور تحریف معنوی ٹھہرتی ہے۔ تاویل میں غور کرنے کے لئے مندرجۂ ذیل شرائط لازمی ہیں :

ا۔ دل خوفِ الٰہی سے لبریز ہو۔

ب۔ عربی زبان میں کامل دستگاہ ہو اور عربی عبارت کے اسلوب اور طرزِ ادا کی معرفت حاصل ہو۔

ج۔ دل میں کسی خود ساختہ نظریہ یا تخیل کے لئے ہٹ دھرمی نہ ہو، بلکہ صحیح دلائل کی روشنی میں حق تک پہنچنا مقصود ہو۔

د۔ جو عبارت زیرِ غور ہو اُسے قرآن حکیم کے بنیادی تصورات کے تحت سمجھا جائے۔ لہٰذا لازم ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث پر حتی الوسع کامل معلومات حاصل ہوں۔

ر۔ اگر کسی آیت یا کسی حصۂ آیت پر سوچنا مقصود ہو تو اسے اپنے سیاق و سباق (پس و پیش) کے ربط میں دیکھا جائے۔

س۔ تاویل اختیار کرنے کے لئے پختہ دلیل ہو۔ کوئی قوی تر دلیل اس کی مخالفت نہ کرے۔

قرآن حکیم میں ایک عام انسان کی رہنمائی کے لئے جو اصول بیان کئے گئے

---

[1] اتقان۔ نوع ۷۰۔

ہیں وہ اتنے سادہ اور قریب الفہم ہیں کہ پہلی ہی نگاہ میں ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عبادات اور اخلاق وغیرہ کے بارے میں ہدایات جیسے نماز پڑھو، رمضان کے روزے رکھو، سچ بولو، دیانتدار رہو، اتفاق رکھو، والدین کا ادب کرو، ہمسایوں کے ہمدرد رہو وغیرہ۔ ان کی سمجھ فوراً حاصل ہو جاتی ہے اور ہر انسان ان کی روشنی میں کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ (ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے) لیکن قرآن حکیم کے بعض مطالب اور مسائل ایسے ہیں کہ فقط پختہ کار اصحاب علم ہی ان تک رسائی پا سکتے ہیں۔ تفسیر کا فریضہ انہی کو زیب دیتا ہے۔ عوام اور کم علم اصحاب کو فقط سادہ مسائل تک محدود رہنا چاہیے۔

تاریخِ تفسیر

تفسیر کی تاریخ مندرجۂ ذیل ادوار میں تقسیم ہے:

پہلا دَور — حیاتِ نبوی — ۱۱ ہجری تک۔ اس دَور میں تفسیر کا مصدر ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات تھی۔

دوسرا دَور — یہ دَور خلافتِ راشدہ کا (۱۱ تا ۴۰ ہجری) ہے۔ ان ایّام میں صحابۂ کبار جنہوں نے بلوغ کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، علومِ دینی کا مرکز تھے۔

تیسرا دَور — یہ دَور اموی سلطنت کے قیام سے اختتام تک ہے۔ اس دَور میں تفسیر پر سادگی غالب رہی۔

چوتھا دَور — یہ دَور حکومتِ عباسیہ کے آغاز سے زوال تک ہے۔ اس دَور میں نقل کے ساتھ عقل بھی تفسیر پر برابر کا حق جتاتی نظر آتی ہے۔ اس دَور میں اساسی تفسیریں مثلاً تفسیرِ طبری، کشّاف اور تفسیرِ کبیر لکھی گئیں۔

پانچواں دَور — یہ تقلیدِ محض کا دَور ہے جو زوالِ بغداد کے بعد

تیرھویں صدی ہجری تک رہا۔ اس دَور کی تفسیروں میں تفسیرِ بیضاوی، تفسیرِ جلالین اور تفسیرِ ابن کثیر وغیرہ مشہور ہیں۔

چھٹا دَور ——— تیرھویں صدی ہجری تا حال ——— اس دَور میں یورپ کے جدید علوم نے اسلامی خیالات پر بھی اثر ڈالنا شروع کیا اور تجدد پسند مفسرین ظاہر ہوئے۔

اب ہم مندرجۂ بالا ادوار پر فرداً فرداً تفصیل سے نگاہ ڈالیں گے۔

پہلا دَور ——— یہ دَور عہدِ رسالت کا ہے۔ وصالِ نبوی کے ساتھ یعنی ۱۱ ہجری میں ختم ہوتا ہے۔ تفسیر کا وجود خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت سے ہے۔ قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب کی وضاحت آپؐ وقتاً فوقتاً فرمایا کرتے تھے۔ بعض توضیحات کا تعلق اعمال سے تھا۔ مثلاً قرآنِ حکیم نے نماز کا حکم دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز کے اوقات، وضوء کا طریقہ، نماز کی رکعات اور دیگر متعلقہ ہدایات جاری فرمادیں۔ حضورؐ نے بعض آیات کی توضیح محض علمی نقطۂ نظر سے بھی کی ہے۔ جامعِ ترمذی میں تفسیری احادیث کا ایک وسیع باب ہے جسے علٰحدہ لکھا جائے تو پوری کتاب بن جائے۔ بعض علماء نے آپؐ کی تفسیری احادیث کے الگ مجموعے بھی مرتب کئے، لیکن آج ناپید ہیں۔ کیونکہ ان کی مندرجات کتبِ تفسیر میں نقل ہوگئیں اور علٰحدہ کتابوں کی ضرورت نہ رہی۔

دُوسرا دَور ——— خلافتِ راشدہ (۱۱ ہجری سے ۴۰ ہجری تک)

بعض صحابۂ کرامؓ علم التفسیر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نمایاں طور پر فیض یاب ہوئے۔ ان میں خلفائے اربعہؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور اُبیؓ بن کعبؓ کا پایہ بلند ترین ہے۔ حضرت علیؓ کی تفسیری مرویات سب سے زیادہ ہیں[1]۔

---

[1] اتقان۔ نوع ۸۰۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے نو عمری ہی میں قرآن فہمی میں نام پیدا کر لیا تھا۔ ان کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا مانگی تھی:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ۔ (اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا کر)

یہ دعا بار آور ہوئی اور ابن عباسؓ ترجمان القرآن کہلائے۔ ان سے بے شمار تفسیری روایات منقول ہیں۔ کئی تفسیری نسخوں کا ذکر ان کے نام سے ملتا ہے[1]۔ مثلاً تنویر المقباس نام کی ایک تفسیر چھپ کر عام ہو چکی ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں آپ کی خود نوشت نہ تھیں۔ آپ کی مرویات بعد میں قلم بند ہو کر آپ کے نام سے شہرت پا گئیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے آپ کی تفسیری روایات کو تحقیق کے بعد انتخاب کیا اور مجموعہ کا نام فتح الخبیر رکھا ہے۔

صحابہؓ کرامؓ کے دور میں قرآن کا علم ایک عملی علم تھا۔ لوگ صرف انہی باتوں میں غور کرتے تھے جو آئے دن کی ضروریات سے پیش آتیں۔ لہٰذا اس عہد میں تفسیر کا سرمایہ محدود رہا۔ کوئی حل طلب مسئلہ اٹھتا تو قرآن وحدیث سے استفادہ کرتے یا ان کی روشنی میں خود اجتہاد کرتے تھے۔ مشکل الفاظ کی تشریح کے لئے قبل اسلام کے اشعار سے بھی مدد لیتے تھے۔

تیسرا دور ——— یہ دور اُموی سلطنت کی ابتداء سے انتہاء تک یعنی ۴۰ ہجری سے دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل تک ہے[2]۔

اس دور کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

۱۔ لغات ومحاورات کی تحقیق کا دائرہ پھیل گیا۔

۲۔ صرف ونحو کے فنون ایجاد ہوئے۔

---

[1] اتقان۔ نوع ۸۰ [2] اُموی حکومت کا خاتمہ ۱۳۲ھ میں ہوا۔

۳۔ بعض اسرائیلی الاصل علماء مثلاً تمیم داری، کعبُ الاحبار اور وَہب بن مُنَبّہ وغیرہ نے اسرائیلی روایات کے دفتر لگا دیے۔ ان روایات کا پایہ داستان گووں اور واعظوں کے قصّوں سے اونچا نہ تھا۔ لیکن عدم احتیاط سے جزوِ تفسیر ہوگئیں۔

۴۔ جعلی احادیث کی کثرت ہوئی جنہوں نے تفاسیر میں بھی دخل پایا، لیکن علماء نے ان کی قلعی کھولنے میں کسر نہ چھوڑی۔

۵۔ فرقہ بندی نے جنم لیا اور معتزلہ و قدریّہ ایسے نئے کلامی اور منطقی گروہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے تفسیر پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کیا اور اختلاف کا دروازہ کشادہ کر دیا۔

اگر علمائے حق دادِ تحقیق نہ دیتے اور کھوٹے کو کھرے سے جُدا نہ کرتے تو تفسیری روایات کا غلط حصہ ہمیشہ کے لئے غالب آجاتا، لیکن اس کا فوراً تدارک کر دیا گیا۔

اِس دَور میں علومِ قرآن کے ماہرین میں ائمّہ اہلِ بیت مثلاً امام زین العابدینؒ، حضرت محمد باقرؒ اور جعفر صادقؒ سرِفہرست ہیں اور بھی متعدد علماء تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں خدمتِ قرآن کے لئے وقف کر دی تھیں۔

ابن عباسؓ کے مولیٰ عکرمہ نے تفسیر میں ایک کتاب لکھی۔ سعید بن جُبیر نے بھی ایک تفسیر سپردِ قلم کی جو بعد میں عطا بن دینار کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کے علاوہ مجاہد تابعی کی تفسیر اور بدءُ الخلق میں ہمام بن مُنَبّہ کی کتاب بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس عہد میں تفسیر کے جو مجموعے لکھے گئے ہیں، ان میں بھی تفسیری روایات کا ایک معتد بہ حصہ تھا۔

اِس دَور کی تفاسیر حسبِ سابق بہت سادہ تھیں۔ آیت کے تحت احادیثِ رسولؐ اور اقوالِ صحابہؓ و تابعین لکھ دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ البتہ کلامی اور منطقی فرقوں

نے نکتہ سرائیاں بھی کیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان فرقوں کی تحریری تفاسیر کا کوئی قابلِ ذکر سرمایہ نہ تھا۔

چوتھا دَور ——— اِس دَور کی ابتداء عباسی عہدِ حکومت کے ساتھ ہوتی ہے۔ عباسی عہد علوم و فنون کا دورِ شباب تھا۔ نقلی علوم مثلاً حدیث، تاریخ وغیرہ کے پہلو بہ پہلو عقلی علوم مثلاً فلسفہ، منطق، طبیعیات وغیرہ نے بھی عروج پایا۔ عقلی علوم نے دوسرے ہی دَور سے تفسیر کے دائرہ میں دخل پانا شروع کیا تھا، لیکن زیرِ نظر دَور میں بعض اصحابِ علم کی جانب سے انہیں بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ اہلِ نقل اس روش کے خلاف تھے، اس لئے علماء کے دو گروہ ہو گئے۔

(۱) **اہلِ عقل**: یہ عقلیت پسند گروہ تھا جو فلسفہ و کلام اور منطق کا شیدائی تھا۔ ان لوگوں نے بعض نہایت انوکھی تفاسیر لکھیں جن میں ابو علی جُبائی معتزلی (متوفی ۳۰۳ھ) کی تفسیر بہت نمایاں تھی۔ ابو یوسف قزوینی رئیس المعتزلہ (متوفی ۴۸۸ھ) کی تفسیر کے تین سو سے زائد اجزاء تھے۔ ابنِ شاہین واعظ (متوفی ۳۸۵ھ) نے ہزار جلد میں تفسیر لکھی۔

(۲) **اہلِ نقل**: یعنی اہلِ حدیث، یہ لوگ تفسیر کے معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ حتَّی الامکان روایت سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔

اس دَور میں روایت پر کڑا احتساب بیٹھ گیا تھا۔ جرح و تعدیل کے قواعد مرتب ہوئے جن کی مدد سے حدیث کو جانچا جاتا تھا کہ صحت کے معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

اس اثناء میں علومِ قرآن کی تعداد بڑھتے بڑھتے تقریباً سو کو پہنچ گئی۔ ان میں کثیر تالیفات مرتب ہوئیں۔ اب ایک مفسّر کے لئے مشکل ہو گیا کہ وہ ان سب علوم کا جامع ہو سکے۔ اس لئے طبری کے بعد کے مفسّرین اپنے اپنے فنون میں محدود نظر

آتے ہیں۔

اس دور میں کئی تفاسیر معرضِ وجود میں آئیں۔ ان میں علامہ طبری، زمخشری اور رازی کی تفاسیر معیاری حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ہم تک صحیح و سالم پہنچی ہیں۔ دیگر تفسیریں ناپید ہو گئیں۔

طبری (۲۲۴ تا ۳۱۰ھ): ابو جعفر محمد بن جریر طبری کا دماغ قدرتِ الٰہی کا ایک نادر کرشمہ تھا۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ تفسیر، حدیث، تاریخ، فقہ، نحو، لغت، منطق، حساب، طب ایسے علوم میں وہ کمال پیدا کیا کہ ہر فن میں یگانۂ عصر ہو گئے۔

آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے آپ کی تاریخ اور تفسیر ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ یہ اس قدر ضخیم ہیں کہ ان کی جلدوں کو یک جا اٹھانے کے لئے اچھی خاصی تندرستی درکار ہے۔

آپ نے تفسیر کا نام جامع البیان عن تاویل القرآن رکھا ہے۔ یہ تفسیر تمام سابقہ تفسیری علوم کا خلاصہ ہے۔ یہ خلاصہ آپ نے پہلے تیس ہزار اوراق پر پھیلانا چاہا تھا شاگردوں کی درخواست پر تین ہزار ورقوں میں سمیٹا جو باریک حروف میں چھپ کر بڑی تقطیع کے پانچ ہزار صفحے بنتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے چار سو برس بعد ابنِ کثیر نے اس کا مزید خلاصہ کیا، جسے تفسیر ابنِ کثیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابنِ کثیر نے انہی روایات کو لیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح تھیں۔

طبری نے آیات کے تحت روایات کو مع احادیث کے درج کر دیا ہے۔ ان میں ضعیف حدیثوں کی کمی نہیں، اس لئے ابنِ کثیر کو اس میں چھان پھٹک کی ضرورت ہوئی۔ طبری نے زبان و بیان کے تمام مروجہ علوم اپنی تفسیر میں جمع کر دیے ہیں۔ مقدمہ میں قراءت، تاویل بالرائے، اسمائے قرآن اور اسمائے سُوَر وغیرہ پر بحث ہے۔

تفسیر کے دَوران لغوی اور نحوی تحقیقات میں زبان دانی کے خوب جوہر دکھاتے ہیں۔ جا بجا اشعار اور امثال کی شہادت لاتے ہیں۔ جہاں فقہی مسائل ہیں وہاں فقہ کا امام بن کر ان کو حل کیا ہے۔ کلامی اور مخالف العقیدہ فرقوں سے بحثیں چھیڑ کر ان کی تردید بھی کرتے ہیں، لیکن رُکتے کہیں نہیں۔ ایک ہموار اور استوار راہ پر چلے جاتے ہیں۔

طبری کی تفسیر معارفِ اسلامیہ کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے جس سے کسی زمانہ کے علماء بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اس پر تبصرہ کرنے کے لئے بھی ایک مجلّد کی ضرورت ہے۔ گیارہ صدیاں گذر چکیں، لیکن اس کی شان بدستور قائم ہے۔

حال ہی میں محمود محمد شاکر اور احمد محمد شاکر کے زیر ادارت مصر میں اس کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن چھپا ہے، جس کے حاشیہ میں احادیث مندرجہ کی جرح و تعدیل اور دیگر اہم نوٹ ہیں۔ خاتمہ پر ازبس مفید فہرستیں ہیں۔

زَمَخْشَری (۴۶۷-۵۲۸ھ): ابوالقاسم جارُاللہ محمود بن عمر الزمَخْشری کا نے تفسیر کی ایک نئی روش نکالی۔ ان کی تفسیر کا نام الکشّافُ عَنْ حقائق غَوَامِضِ التنزیل ہے۔ مختصراً فقط کشّاف کہلاتی ہے۔ یہ ضخیم کتاب لسانی علوم کا مخزن ہے۔ زمخشری تفسیر نحو، لغت اور ادب میں امام تھے۔ ازبس وسیع العلم تھے۔ آپ نے اپنی تمام معلومات اس کتاب میں جمع کر دی ہیں۔ اسی خوبی کے سبب ہر جماعت کے لوگ اس کتاب سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ اس میں معتزلی عقائد کی تبلیغ ہے۔ فرقۂ معتزلہ مدّت سے ناپید ہے۔ لیکن یہ تفسیر جو اس کی پُرزور وکالت کرتی ہے اپنے لسانی جوہروں کے دم سے آج تک زندہ ہے۔

زمخشری تفسیری روایات میں اسناد چھوڑ جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ راوی کا نام لیتے ہیں۔ کتاب میں دستورِ سابق کی طرح جاہلیت کے اشعار بھی

ملتے ہیں۔

رازی (۵۴۴ھ تا ۶۰۶ھ) فخر الدین ابو بکر محمد بن عمر رازی نے مفاتیح الغیب کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے۔ یہ بہت ضخیم تالیف ہے۔ اس لئے تفسیر کبیر کے نام سے معروف ہے۔ اس کا ایک باریک ٹائپ کا ایڈیشن بڑی تقطیع کے پانچ ہزار صفحات پر قابض ہے۔[1]

امام رازی نے زمخشری کی لسانی مہارت کا سکہ مانا ہے۔ لیکن ان کے معتزلی خیالات کے دشمن ہیں۔ اس تفسیر میں انہوں نے کشاف کے پیش کردہ عقائد کو توڑنا چاہا ہے۔

رازی نے عقل و نقل کا تمام ماقبل سرمایہ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ پڑھنے والا راسخ العلم نہ ہو تو یوں کھو جائے کہ گوہرِ مقصود (یعنی معرفتِ قرآن) نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ یہ کتاب علم کا زخّار سمندر ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے بھی وسیع علم چاہیے۔ ایک عام علمی سطح والے کے لئے مشکل ہے کہ وہ اس سے صحیح طور سے مستفیض ہو سکے۔ اتنی ضخیم کتاب کے مطالعہ میں دل اسی صورت میں جم سکتا ہے کہ علم کی گہری لگن ہو۔

صرف تعوّذ کی تشریح نے ۴۸ صفحات کو عبور کر کے دم لیا ہے۔ یہی طول بسم اللہ کی تفسیر کا ہے۔ سورۂ فاتحہ پر بحث پوری مجلّد میں ہے۔ باقی مضامین کا قیاس کیجئے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اس میں سوائے تفسیر کے اور سب کچھ موجود ہے۔[2]

بہر حال علمی نکتہ نگاہ سے یہ کتاب معلومات کا مفید خزینہ ہے۔

زندگی نے رازی کو مہلت نہ دی کہ اس کتاب کی تکمیل اپنے ہاتھوں کرتے۔ اس کا ½ حصہ ان کی اپنی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ باقی کسی اور صاحب کی تصنیف ہے۔[3]

---

[1] فوائد البہیہ از عبد الحی۔ ابن خلکان۔ [3] اتقان۔

انہوں نے رازی کی طرز کو ایسا نبھایا ہے کہ دونوں میں فرق نظر نہیں آتا۔

پانچواں دَور ——————— (زوالِ بغداد کے بعد یعنی ساتویں صدی سے تیرھویں صدی ہجری تک) یہ تقلید کا دَور ہے۔ مفسرین نے گزشتہ تفاسیر کو اپنے طور سے پیش کیا ہے۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) بیضاویؒ : عبداللہ بن عمر بیضاوی شیراز کے قاضی القضاۃ تھے۔ سالِ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ غالباً ۶۹۱ ہجری ہے۔ آپ نے اپنے پیشرو علماء کی کئی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ قرآنِ حکیم کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام انوارُ التنزیل و اسرارُ التاویل ہے۔ عموماً تفسیرِ بیضاوی کے نام سے مشہور ہے۔ بیضاویؒ نے اس میں کشّاف کے فلسفیانہ زوائد اور معتزلی خیالات کو نکال کر مختصر ہی نہیں کیا بلکہ سابقہ تفاسیر کے فوائد بھی اس میں جمع کئے ہیں۔

تفسیرِ بیضاوی کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب اس کا اختصار اور سادگی ہے۔ لُغت، قواعد اور قراءت وغیرہ کے فنون پر یہ ایک کامل تصنیف ہے۔ بیضاوی نے زمخشری سے بھی بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں اس سے بحث نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعد کا کوئی عالم اس میدان میں بیضاوی کو مات نہیں دے سکا۔ سب آپ کی خوشہ چینی پر مجبور ہیں۔

(۲) ابنِ کثیرؒ (۷۰۱ تا ۷۷۴ھ) : ابنِ کثیر نے طبری کی تفسیر میں تحقیق کر کے اس کو مختصر کیا ہے۔ یہ کتاب تفسیر ابنِ کثیر کے نام سے مشہور ہے۔ ابنِ کثیر نے انہی روایات کو لیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہیں۔

(۳) جلالین : جلال الدین محلی (متوفی ۸۶۴ھ) نے ایک تفسیر کا آغاز کیا۔ پہلی سترہ سورتوں تک لکھی اور نا تمام چھوڑ کر رحلت کر گئے۔ ان کے شاگرد جلال الدین سیوطی (۸۴۹ تا ۹۱۱ھ) نے اسے انجام کو پہنچایا۔ دونوں مفسروں کا نام جلال الدین تھا۔ اس لئے

اس کتاب کا نام تفسیرِ جلالین پڑا۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے۔ ہمارے دینی مکاتب میں رائج ہے۔

جلال الدین سیوطی نے دو اور تفسیریں بھی لکھی تھیں ان میں سے دُرِّ منثور دستیاب ہے۔ سیوطی نے ایک تالیف قرآن کے متفرق علوم پر اتقان کے نام سے لکھی ہے جو ازبس مفید ہے۔

اس اثناء میں اور بھی کئی مستند تفسیریں لکھی گئیں۔ مثلاً امام قرطبی کی الجامع لاحکام القرآن، امام شوکانی کی فتح القدیر، تفسیر خازن، تفسیر مدارک وغیرہ۔

اکبر کے ایک درباری عالم فیضی نے عربی میں ایک بے نقط تفسیر سواطع الالہام کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں کوئی نقطہ دار حرف نہیں۔ اس جدّت کی وجہ سے خاصی مشہور ہے لیکن فنِ تفسیر میں اس کا پایہ مسلّم نہیں۔

چھٹا دَور — تیرھویں صدی ہجری کے اوائل سے تا حال — اس دَور میں یورپی اقوام دنیا پر چھا گئیں اور ان کے نظریات کی اشاعت ہوئی۔ تفسیر بھی ان سے متاثر ہوئی۔ مفسّرین کا ایک گروہ تو اس حد تک ان خیالات سے مرعوب ہوا کہ قرآن کی ہر آیت کو ان کی سائنس اور فلسفہ کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس تجدّد پسند اور زود رائے گروہ کی غلطی بالآخر آشکارا ہو گئی اور قرآن کو اندھا دھند مغربی افکار کی روشنی میں سمجھنے کی روش اب ختم ہو رہی ہے۔ البتہ جدید سائنس کے بعض ٹھوس حقائق کی قرآنِ حکیم سے موافقت ثابت کرنی معیوب نہیں سمجھی جاتی۔

جدید انداز میں سائنسی نقطۂ نظر سے مصر کے علامہ جوہری طنطاوی کی تفسیر بہت ممتاز ہے۔

تراجم

قرآن حکیم کے ترجموں کا آغاز تیسری صدی ہجری کے پس و پیش ہو گیا تھا۔ غالباً سب سے پہلے سپین کے نومسلموں کے لئے ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد مزید زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ فارسی ترجمہ سمیت موجود ہے۔ یہ ترجمہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کا نظر آتا ہے۔ ایک ترجمہ شیخ سعدیؒ سے بھی منسوب ہے۔ سعدی تقریباً سات صدی قبل ہو گزرے ہیں۔

ابتداء میں علمائے کرام نے تراجم کی مخالفت کی اس لئے ان کی اشاعت بہت مشکل تھی۔ علمائے کرام کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ بغیر استاد کے ترجمہ پڑھنے سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی اور نیز یہ کہ فقط قرآن کا ترجمہ پڑھ کر بعض کم علم لوگ قرآن کے مفسر بن بیٹھیں گے۔ یہ مصلحت بجا تھی لیکن اس کا اثر صرف اہلِ اسلام پر ہو سکتا تھا۔ غیر مسلم پابند نہ تھے اس لئے سب سے پہلے یورپ میں قرآنِ حکیم کے ترجموں کی اشاعت عام ہونے لگی۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ایک یورپی بادشاہ کے حکم سے سورۃُ المعارج کا سپینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل یعنی ۵۳۸ ہجری (۱۱۴۳ع) میں لاطینی زبان میں قرآن کا شروع ہو چکا تھا۔ یہ ترجمہ چار سو برس بعد یعنی ۹۵۰ ہجری (۱۵۴۳ء) میں شائع ہوا۔ جرمن میں اوّلین ترجمہ مارٹن لُوتھر (وفات ۱۵۴۶ع) نے کیا۔ اُس نے قرآن ہی کے زیرِ اثر یورپ میں مذہبی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے بعد یورپ کی بعض اور زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ ان کی اشاعت کے اوّلین سال

ڈچ میں ———	۱۰۵۱ ہجری	(۱۶۴۱ عیسوی)
فرانسیسی میں ———	۱۰۵۷ "	(۱۶۴۷ ")
انگریزی میں ———	۱۰۸۰ "	(۱۶۶۹ ")

روسی زبان میں ——— ۱۱۹۰ ہجری (۱۷۷۶ عیسوی)

غیر مسلموں کے تراجم نیک نیتی پر مبنی نہیں ہو سکتے تھے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اہلِ اسلام میں بھی تراجم کی اشاعت تیز تر ہو گئی جس سے یورپ کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کا تدارک ہو سکتا تھا۔ ہندوستان میں پہلی بار مستند اور زندۂ جاوید ترجموں کا شرف شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کو نصیب ہوا۔

حضرتِ شاہ ولی اللہؒ نے ۱۱۵۰ ہجری میں قرآنِ حکیم کا فارسی ترجمہ مکمّل کیا۔ ان کے دو فرزندوں حضرتِ شاہ رفیع الدینؒ (۱۱۶۳—۱۲۳۳ھ) اور شاہ عبد القادرؒ (۱۱۶۷—۱۲۳۰ھ) نے اردو میں ترجمے کیے۔ مؤخر الذکر ترجمہ ۱۲۰۵ ہجری میں تکمیل کو پہنچا۔

عربی زبان سے واقفیت اور علمِ دین سے پوری آگاہی کے بغیر فقط ترجمہ پڑھنے سے جو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس سے امام ولی اللہ اور ان کے صاحب زادے بے خبر نہ تھے:

حضرت شاہ عبد القادرؒ نے اپنے ترجمہ کا ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں اردو ترجمہ کے بعض ضروری امور کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چند امور انہی کی عبارت میں کچھ تصرف کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

اوّل: ہر لفظ کے معنی جدا جدا ضرور نہیں کیونکہ ہندی اور عربی کے محاورے ہرگز موافق نہیں۔ الفاظ جس طرح قرآن شریف میں ہیں۔ اسی طرح ان کے معنی جدا جدا لکھیں تو ہرگز کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔

دوم : ہندی زبان ہیں جو معنی آسان ہیں اور ہر ایک پڑھ سکتا ہے
اس میں بھی اُستاد کی سند چاہیئے۔ کیونکہ قرآن شریف کے معنی
بغیر سند کے اعتبار نہیں رکھتے۔

سوم : اگلی اور پچھلی آیات کو ملانا اور معانی کا کسی جگہ ختم ہو جانا اُستاد
کے بغیر معلوم نہیں ہوتا۔

چہارم : اس کتاب کا نام **مُوضِح قرآن** ہے۔ یہی اس کی
صفت اور یہی اس کی تاریخ ہے

یاد رہے کہ کتاب کا نام موضح القرآن نہیں بلکہ مُوضِح قرآن
ہے جس کے عدد ۱۲۰۵ ہیں۔ یہی اس کا سنۂ تالیف ہے۔

حضرتِ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ دونوں نے اپنے والدِ ماجد
کے فارسی ترجمہ سے استفادہ کیا ہے۔ حضرتِ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بہت حد
تک تحتُ اللفظ ہے۔ نہایت مدید محنت اور غور و فکر کا ماحصل معلوم ہوتا ہے۔
شاہ عبدالقادرؒ اردو میں رواں اور بامحاورہ ترجمہ کے امام ہیں۔ اور کسی ترجمہ
میں ان کی سی کاوش کا نشان نہیں ملتا۔ یہ ترجمہ کئی برس کی محنت کا ثمر ہے۔

بعد کے سب محتاط ترجمہ نگاروں نے ان ترجموں کو بطورِ بنیاد سامنے رکھا
ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں : جب ایک
خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے، ایک فارسی ترجمہ مولانا
شاہ ولی اللہ کا، اکٹھے دو اُردو کے، ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا اور
ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا تو اب ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہو گیا مگر
خاندانِ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ
ہرگز قرآن کا مُترجم نہیں بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں

کا مترجم ہے۔

خاندانِ ولی اللہ کے بعد ترجموں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ۱۲۹۳ ہجری میں سندھی میں اور اس کے چار برس بعد پنجابی میں بھی ترجمہ ہوا۔ دنیا کی تقریبًا ہر زبان میں قرآن کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن جتنے ترجمے اردو زبان میں ہوئے اتنے غالبًا کسی زبان میں نہیں ملیں گے۔

باب ہفتم

اسبابِ نزول

سببِ نزول سے مراد ہے قرآنِ حکیم کی کسی آیت کے نازل ہونے کی وجہ یا محل۔ اسے شانِ نزول بھی کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی کئی آیات خاص موقعوں پر نازل ہوئیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر آیت کا حکم عین اسی موقع کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس کا اطلاق اس کے نزول کے سبب یا محل کی روشنی میں عام معنی میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قرآنِ حکیم کی ایک آیت ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ... الخ (اے نبیؐ! (صحابہ) آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں۔ فرما دیجیے کہ جو (ضرورتوں سے) بچ جائے) اس آیت کے نزول کا سبب اگرچہ صحابہؓ کا ایک سوال ہے لیکن اس کا حکم فقط صحابۂ کرامؓ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حکم سب مسلمانوں کے لیے تاقیامت باقی رہے گا۔ ایک صحابی کعب بن عُجرہؓ ایک روایت کے بارے میں کہتے ہیں: نَزَلَتْ فِيَّ خَاصَّةً وَهِيَ لَكُمْ عَامَّةً۔[1] (یہ میرے بارے میں خصوصیت سے نازل ہوئی ہے اور تمہارے بارے میں عمومیت رکھتی ہے)۔

---

[1] بخاری باب المُحْصَر۔

اگرچہ مجموعی لحاظ سے سارے قرآن حکیم کے نزول کا ایک مجموعی سبب یا شان ہے لیکن انفرادی لحاظ سے ایسی آیات کی تعداد زیادہ نہیں جن کا ایک خاص سبب یا محلّ ہو۔ علمائے سلف نے سببِ نزول کو وسیع تر معنی میں لیا ہے۔ اس لئے ایسی آیات جن کا سببِ نزول روایت کیا جاتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نیز ایک ہی آیت کے سببِ نزول کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علمائے قدیم کا طریقہ تھا کہ آیت کا مصداق جو بات ہوتی اس کے بارے میں کہہ دیتے: نَزَلَتْ فِی کَذَا یعنی فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا مطلب ان کے ذہن میں یہ نہیں ہوتا تھا کہ آیت عین اس موقع پر نازل ہوئی بلکہ یہ تھا کہ آیت کا حکم اس واقعہ پر نافذ ہوتا ہے۔ اس بارے میں روایات کا جو اختلاف ہے اس کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:

(۱) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے کوئی سوال کیا۔ آپؐ نے اجتہاد سے جواب دیا اور تائید میں کوئی آیت پڑھ دی۔ راوی نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بجائے تلاوت کے نزول کا لفظ استعمال کیا اور آیت کے بارے میں کہا: نَزَلَتْ فِی کَذَا یہاں آیت کے نزول سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہنِ مبارک میں اس کا خیال آیا۔

ایسی صورتوں میں راوی جب نزول کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے یوں مراد لی گئی ہے۔ چونکہ ایک آیت کا اطلاق ایسے کئی واقعات پر ہو سکتا ہے جو بعینہٖ یا بہت حد تک ایک دوسرے کے مانند ہوں اس لئے بعض آیات کے سببِ نزول کے بارے میں مختلف اقوال رائج ہو گئے حالانکہ ضرور نہیں کہ یہ نزول کا سبب ہوں۔

(۲) صحابہؓ نے کسی آیت کی اپنے طور سے تفسیر کی اور استشہاد کے لئے کوئی واقعہ بیان کر دیا۔ بعد میں اسے بھی سببِ نزول سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ اس سے فقط یہ مراد ہے کہ یہ آیت اس واقعہ پر صادق آتی ہے۔

اسبابِ نزول کی مندرجۂ بالا دو قسمیں حقیقی نہیں اعتباری ہیں۔ ان سے مقصود آیات کی وضاحت ہے۔ یہ اقوال مختلف تفسیروں کا حکم رکھتے ہیں۔ مفسّر کے لئے ان اقوال کا جاننا ضروری ہے۔ حضرتِ ابو درداءؓ کا قول ہے کہ آدمی اس وقت تک فقیہہ نہیں ہو سکتا جب تک ایک آیت کو کئی محل پر رکھ کر اس میں غور نہ کر سکے۔ مندرجۂ ذیل انواع کی واقفیت سے قطعاً چارہ نہیں۔

(۱) ان واقعات کی تفصیل جن کی طرف قرآنِ حکیم میں واضح اشارے ہیں۔ اگرچہ ایسے قصے روایات میں بکثرت آ گئے ہیں جن کی حیثیت محض افسانوی ہے لیکن جو واقعات صحیح بخاری وغیرہ مستند کتب میں مرفوعاً مذکور ہیں ان کا پایہ مسلّم ہے۔ تاریخ کی معتبر کتابیں بھی اس باب میں رہنمائی کرتی ہیں۔

(۲) وہ واقعات جن سے مشکلات کا حل نکلتا ہو اور فقہی رہنمائی ہوتی ہو۔ نزول جاننے کے متعدد فوائد ہو سکتے ہیں مثلاً:

(۱) توجیہ[۱] کلام کی حقیقت سمجھانا۔

سورۃِ بقرہ میں ارشاد ہے: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ[۲]

---

[۱] توجیہ کے معنی ہیں: کلام کا وجہہ (یعنی چہرہ) دکھانا۔ اصل مطلب بتانا۔ مشکل حل کرنا شبہ اور تناقض دور کرنا۔ تاویل وغیرہ۔

[۲] آیت - ۵۸

بِّطَوَّفَ بِهِمَا (یقیناً صفا اور مروہ اللہ کے شعائر سے ہیں۔ تو جس نے بیت اللہ کا حج کیا یا عمرہ کیا تو اس پر گناہ نہیں کہ ان دو میں طواف کرے)۔ آیت میں چونکہ صرف اتنا ارشاد ہے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں گناہ نہیں اس لئے بعض صحابہؓ نے یہ خیال کیا کہ طواف واجب نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اس غلط فہمی کی تصحیح کی اور فرمایا کہ بعض اصحاب کا خیال تھا کہ صفا اور مروہ کے طواف کو جاری رکھنا گناہ ہے۔ اس کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ طواف گناہ نہیں۔

(۲) حکم کا دائرۂ عمل معلوم ہوتا ہے کہ خاص ہے یا عام۔ مثلاً قرآن کی ایک عبارت ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ۔ یہاں ظلم کے عام معنی مراد نہیں بلکہ شرک مراد ہے جو یہاں خاص معنی ہیں۔ اس کا ثبوت جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک فرمان سے ملتا ہے۔

(۳) بعض دفعہ سببِ نزول سے حکم کی علّت معلوم ہو جاتی ہے اور قیاس کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(۴) قرآنِ حکیم کے کلمات کا طریقِ تلفّظ معلوم ہو جاتا ہے۔

(۵) سورتوں اور آیات کا فصل معلوم ہو جاتا ہے۔

(۶) یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ حکیم پر کس طرح عمل فرمایا۔

مُحکم و مُتشابہ

مُحکم اور متشابہ کے الفاظ کئی معنی رکھتے ہیں۔ بعض معنی کے لحاظ سے ان میں باہم اختلاف ہے اور بعض کے لحاظ سے ان میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً

(۱) محکم کے معنی ہیں: پختہ، مضبوط اور استوار۔ مثلاً قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ (ھود) ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں)۔ مراد یہ کہ ان میں باطل دخیل نہیں ہو سکتا۔

اس لحاظ سے سارا قرآن محکم ہے۔

متشابہ کے معنی ہیں: یکساں، مثیل۔ قرآن حکیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کتاباً متشابھاً۔ مراد یہ کہ اس کی آیات مضمون یا الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مانند ہیں۔ اس میں آیات کی کافی تکرار ملتی ہے۔ بعض قصے الگ مقامات پر ادنیٰ تغیر سے دُہرا دیئے گئے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے سارا قرآن متشابہ ہے۔ لہٰذا مذکورہ معانی کو دیکھا جائے تو محکم اور متشابہ میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔

(۲) ذیل کی آیت میں محکم اور متشابہ کے لفظ متضاد معنی میں آئے ہیں:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘؔ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (آل عمران آیت ۶)

ترجمہ: وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اُتاری۔ اس میں بعض محکم آیات ہیں جو کتاب کی اصل ہیں۔ اور دیگر متشابہ آیات ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کی طلب میں اس کے متشابہ حصہ کے درپے ہوتے ہیں۔ اس کی تاویل سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور پختہ علم لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ صرف عقل والے لوگ نصیحت پکڑتے ہیں۔

یہاں محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم سمجھ میں آسکے اور متشابہ آیات وہ ہیں جن کے کامل ادراک سے انسانی ذہن عاجز ہو۔ ان آیات کی تاویل میں حد سے نہیں نکلنا چاہیے۔ ان کے ایک سے زائد کئی معانی ہو سکتے ہیں۔ صرف اسی معنی کو اختیار کرنا چاہیے جو محکم آیات کے مشابہ ہو کیونکہ محکم آیات قرآن کی اصل ہیں۔ اگر متشابہات کی تفسیر محکمات کی موافقت میں ہو سکے تو بہتر ورنہ اپنی عقل و خرد پر ناز کر کے بے بنیاد معنی آفرینی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ حرکت وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہو۔

بعض متشابہات ایسی ہیں کہ ان کا کامل ادراک کبھی نہیں ہو سکتا مثلاً حروفِ مقطعات اور وہ آیات جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات، یومِ آخر اور روح وغیرہ سے ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں ان سے بچ کر رہو[1] ایک شخص صبیغ نام عراق سے چل کر حضرت عمرؓ کے پاس متشابہات کے بارے میں پوچھنے آیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے چھڑی سے پیٹ ڈالا۔

---

[1] دارمی باب الحلال والحرام ج۱ ۔ سیرتِ عمر از ابن جوزی

ناسخ و منسوخ

مفہوم | نسخ کے لغوی معنی درج ذیل ہیں :

(ا) اِزالہ یعنی زائل کرنا یا مٹانا۔

(ب) تبدیل یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کی جگہ رکھنا۔

(ج) تحویل یا نقل یعنی کسی چیز کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا۔

قرآنِ حکیم کی آیات کا نسخ پہلے دو معنی یعنی ازالہ اور تبدیل کے لحاظ سے ہوا ہے۔ اس کی مندرجۂ ذیل صورتیں ہیں :

(۱) آیت کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوئے۔

صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ میں حضرتِ انس رض کی روایت درج ہے کہ بئرِ معونہ کے شہداء کے بارے میں قرآن نازل ہوا تھا جسے ہم پڑھتے تھے لیکن پھر منسوخ ہو گیا۔ صحیح مسلم کی کتاب الزکاۃ میں یہ روایت ہے کہ سورۃ براءت کے برابر کی ایک سورت تھی جو اذہان سے محو کر دی گئی۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر منسوخ آیات کو اللہ تعالیٰ نے ذہنوں سے بہ یک وقت محو کرا دیا۔ اس کا ثبوت سورۃ بقرہ کی آیت ۱۰۶ سے بھی ملتا ہے جس میں ارشاد ہے : مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ط (ہم جو کوئی آیت نسخ کریں یا اسے فراموش کرا دیں تو ہم اس سے بہتر یا اس کے مثل آیت لاتے ہیں)

اس کا قطعی ثبوت سورۃ الاعلیٰ کی مندرجہ ذیل آیت سے ملتا ہے :
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط (اے نبی! ہم آپ کو قرآن پڑھائیں گے۔ پھر آپ نہیں بھولیں گے سوائے اس کے جو اللہ نے چاہا)

اس آیت میں جس کلام کے بارے میں استثنا ہے وہ ایسی آیات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ذہنوں سے فراموش کرا دیا۔

(۲) حکم منسوخ ہوا اور تلاوت باقی رہ گئی۔ ایسی آیات کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سورۂ توبہ (آیت ۸۰) میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

اس آیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اجازت دی گئی ہے کہ آپ مشرکین کے لئے بے شک دعا کریں لیکن اللہ تعالیٰ ان کو بخشے گا نہیں۔ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے لئے دعا کرنے سے منع کر دیا گیا اور سورۂ توبہ کی آیت ۸۴ میں ارشاد ہوا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر ہرگز نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں)۔ اس کی ایک اور مثال سورۃ المجادلہ کی آیتُ النجوٰی (۱۲)[1] ہے جو اس سے آگے کی آیت سے منسوخ ہے۔

اسی طرح آیتِ وصیت (۲-۱۸۰) آیتِ میراث (النساء - ع ۲) سے منسوخ ہے۔

(۳) تلاوت منسوخ ہوئی اور حکم باقی رہا۔

اس کی ایک مثال آیتِ رجم ہے۔

(۴) ازالۂ او ضاف

بارہا جب ہم کسی آیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس کا ایک خاص مفہوم حاصل ہوتا ہے لیکن جب اسی موضوع پر ہم کسی دوسری آیت کو بھی سامنے لاتے ہیں تو یہ مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔ اسے بھی نسخ کہتے ہیں۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں جن میں ایک عام صورت یہ ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کے خاص کو عام یا اس کے مطلق کو مقید کر دیتی ہے۔ اس کو تفسیر، تاویل یا بیان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بیان سے یہاں مراد وضاحت ہے۔

یہ نسخ آیت ہی سے نہیں سنت سے بھی ہوتا ہے۔

یہ نسخ نہایت اہم ہے کیونکہ ایک آیت دوسری آیت کے دائرۂ حکم کو وقتی کر دیتی ہے یا اس کے نئے معنی قرار دیتی ہے۔ یعنی اس کا ظاہری مفہوم کچھ ہوتا ہے لیکن دوسری آیت

---

[1] اس آیت کے منسوخ ہونے کا حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی الفوز الکبیر میں اعتراف کیا ہے۔

کی روشنی میں اس کا باطنی مفہوم ابھر آتا ہے اور وہی صحیح ہوتا ہے مثلاً

(الف) سورۂ انفال میں اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ والی آیت اور اس کے بعد کی آیت ایک دوسرے کے لئے ناسخ و منسوخ ہیں۔ اگر ساز و سامان کی کمی نہ ہو تو میدانِ جہاد میں کم از کم دس گنا زیادہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ساز و سامان وغیرہ کی قلت ہو تو دو گنا تک لشکر کا جم کر سامنا کیا جائے۔ اس سے فرار کی قطعاً اجازت نہیں۔

(ب) شراب کی حرمت تدریج سے ہوئی ہے۔ اس بارے میں وقتاً فوقتاً مختلف آیات نازل ہوئیں۔ ہر آیت نے اپنے سے سابقہ آیت کے نئے معنی قائم کر کے اسے منسوخ کر دیا یہی حال وراثت کی آیات کا بھی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ ..... تو جس کا جی چاہتا تھا روزہ رکھتا ورنہ فدیہ دے دیتا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد کی آیت اتری تو اس کا حکم صرف ان مریضوں یا بوڑھوں کے لئے رہ گیا جن کو صحت کی بحالی کی کوئی امید نہ ہو۔

نسخ کی حکمت

نسخ اصولِ دین یا اخبار میں نہیں ہوتا بلکہ ان احکام میں ہوتا ہے جن کی حیثیت وقتی ہو۔

نسخ میں کئی حکمتیں مضمر ہیں مثلاً

(۱) بندوں کا امتحان۔

اللہ تعالیٰ نے بعض احکام محض آزمائشی طور سے دیئے ہیں مثلاً حالتِ احرام میں شکار کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ تحویلِ قبلہ والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینے سے اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون شخص اسلام پر ثابت قدم رہتا ہے اور کون پلٹ جاتا ہے۔

نسخ کا مسئلہ نہایت نازک ہے اور بعض لوگ فوراً بول اٹھتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ سے پہلے غلطی ہو گئی تھی جسے اس نے منسوخ کر کے نیا حکم دیا ہے۔ مکہ کے مشرکین نے بھی اس قسم کی نکتہ چینی کی تھی۔ جس کے جواب میں سورۂ نحل کی یہ آیات نازل ہوئیں:

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۰۱ - ۱۰۲)

(جب ہم ایک آیت کے بدلے دوسری آیت لاتے ہیں اور اللہ جو نازل کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے تو وہ (نبیؐ سے) کہتے ہیں کہ تو جھوٹ گھڑتا ہے۔ پر ان (مشرکین) سے اکثر نہیں جانتے۔ (اے نبیؐ) آپؐ کہہ دیجیے کہ جبرئیل نے قرآن کو آپؐ کے دل پر آپؐ کے رب کی طرف سے ٹھیک ٹھیک اتارا ہے تاکہ صاحب ایمان لوگ ثابت قدم ہوں اور مسلمان کے لئے ہدایت اور بشارت ہو)

ان آیات میں بھی اس طرف خصوصیت سے اشارہ ہے کہ نسخ پر ایمان لانے اور پختہ رہنے سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

اس سے مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں تبدیلی کی ہے۔ مثلاً پہلے بیت المقدس کو قبلہ ٹھہرایا تھا پھر کعبہ کو قبلہ کر دیا۔ پہلے دو نمازیں فرض تھیں پھر پانچ فرض ہوئیں۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن میں نسخ کیوں مانا جائے۔ اگر یہود اور مشرکین کو نسخ پر اعتراض تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں تبدیلِ احکام پر ہی بنیادی اعتراض تھا لیکن مسلمان کا موقف مختلف ہے۔

(۲) اسلام کی شریعت بتدریج قائم ہوئی۔ اس لئے احکام میں حسبِ ضرورت تبدیلی آتی رہی۔ اگر منسوخ شدہ عبارات قرآنِ حکیم میں بدستور موجود ہیں تو اس کی حکمت ضرور نہیں ہم پر روشن ہو۔ تاہم اتنی حکمت ضرور نظر آتی ہے کہ اس سے اسلام کے ابتدائی معاشرہ کے طریقِ قیام اور قرآن کے اصولِ تدریج کی بعض نہایت اہم تاریخی کڑیاں حاصل ہوتی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ ان کڑیوں کو اللہ تعالیٰ نے تاریخی نقطۂ نظر سے محفوظ کر دیا ہو کیونکہ قرآنِ حکیم تذکیر بایام اللہ کے ذریعے درس کو نتیجہ خیز کرتا ہے۔

تعارفِ حدیث

از

شیخ محمدّ اقبال

ایم، اے (عربی) ایم، اے (اسلامیات) ایم، اے (فلسفہ)

گورنمنٹ کالج۔ لاہور

علمی کتاب خانہ، اُردو بازار، لاہور ۲

عنوانات

عنوان	
باب اوّل	۳
اصطلاحات	۵
اقسامِ حدیث	۱۴
باب دوم (اہمیتِ حدیث)	۲۵
حدیث قرآن کی نگاہ میں	۲۷
حدیث رسول اللہؐ کی نگاہ میں	۴۳
حدیث صحابہؓ کرام کی نگاہ میں	۵۶
حدیث عہدِ صحابہؓ کے بعد	۷۱
حدیث پر ایک عمومی نگاہ	۷۳
باب سوئم (تدوینِ حدیث)	۷۷
پہلا دَور	۷۸
دوسرا دَور	۸۳
تیسرا دَور	۸۷
چوتھا دَور	۹۱
وضعِ حدیث	۹۱
اقسامِ کتب حدیث	۹۶
ہمہ گیر کتب کا آغاز	۹۷
صحاحِ ستّہ	۹۸
تکمیلی جہد	۱۰۳

بابِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِصطلاحات

سُنّت

سُنّت کے لغوی معنی ہیں :

(۱) طریقۂ مسلوکہ یعنی وہ راستہ، جس پر لوگوں کا گزر ہو۔

(۲) راہِ عمل یا طریقِ کار : چنانچہ قرآنِ حکیم میں سُنّۃُ اللّٰہ سے مُراد اللہ تعالیٰ کا طریقِ کار ہے۔

شرع میں سُنّت سے مُراد حضرت محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت یعنی راہِ عمل یا طریقِ زندگی ہے۔ اِصطلاحِ محدثین میں سنّت کی تعریف ہے : حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، عمل یا تقریر۔

(تقریر کے معنی ہیں برقرار رکھنا۔ یہاں مُراد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات کی یا کہی گئی یا آپؐ کے علم میں آئی اور آپؐ نے منع نہ فرمایا)

سُنّت کی جمع سُنَن ہے۔

حدیث

حدیث کے لغوی معنی خبر، بات یا گفتگو کے ہیں۔ اصطلاح میں حدیث اس خبر کو کہتے ہیں۔ جس میں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا قول، فعل، تقریر یا صفت بیان ہو۔ جس حدیث میں قول بیان ہو اسے حدیثِ قولی، جس میں فعل بیان ہو اُسے حدیثِ فعلی اور جس میں تقریر کا ذکر ہو اُسے حدیثِ تقریری کہتے ہیں۔

حدیث کی جمع احادیث ہے۔

حدیثِ قُدسی

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بکثرت الہام نازل ہوا۔ آنحضورؐ جس حدیث میں اللہ تعالیٰ

کی طرف سے کوئی الہام ان واضح الفاظ کے ساتھ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، بیان فرمائیں اسے حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔

خَبَر — حدیث کے لئے خبر کا لفظ بھی آتا ہے، لیکن خبر وسیع تر لفظ ہے، حدیث کے علاوہ تاریخ کے لئے بھی مستعمل ہے۔ البتہ اصطلاح میں اخباری کا لفظ صرف مُورّخ کے لئے آتا ہے۔ جو عالم علمِ حدیث میں مشغول ہو اُسے **مُحَدِّث** کہتے ہیں۔

اَثَر — حدیث کے لئے اثر کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ بالعموم صحابہ رضؓ اور تابعین کے اقوال کے لئے آتا ہے۔

اثر کی جمع آثار ہے۔

بَلاغَہ — کوئی تابعی بلا واسطہ اِن الفاظ کے ساتھ حدیثِ نبویؐ بیان کرے کہ بَلَغَنِی یعنی یہ حدیث مجھ تک پہنچی ہے تو اس حدیث کو بلاغۃ کہتے ہیں۔ اس کی جمع بلاغات ہے۔

رِوایت، راوی، مَروِی، مَروِی عَنہُ — حدیث بیان کرنے کو روایت کہتے ہیں، بیان کرنے والے کو راوی۔ جو حدیث بیان کی جائے اُسے مروی اور جس سے بیان کی جائے اُسے مروی عنہٗ کہتے ہیں۔ درمیانہ راوی کو واسطہ بھی کہتے ہیں۔

روایت کا لفظ حدیث کے معنی میں بھی آتا ہے۔

راوی کی جمع رُواۃ اور مروی کی مرویات ہے۔

راویوں کے طبقات — صحابی راویوں کو طبقۂ اُولیٰ، تابعی راویوں کو طبقۂ ثانیہ اور تبعِ تابعین کو طبقۂ ثالثہ کہتے ہیں۔

صحابی — صحابی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے بحالتِ اسلام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار پایا۔ یا آنحضورؐ نے اُسے دیکھا اور اس نے حالتِ اسلام ہی میں وفات پائی۔

تابعی وہ شخص ہے جس نے بحالتِ ایمان کسی صحابیؓ کو دیکھا اور اسلام پر وفات پائی۔ تابعین میں اُن اہلِ اسلام کا گروہ بھی شامل ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسلام قبول کیا لیکن صحابیت سے مشرف نہ ہو سکے۔ انہیں مُخَضرَمِین کہتے ہیں۔

تَبَعِ تابعین جن اہلِ اسلام نے کسی تابعی کو دیکھا وہ تبعِ تابعین کہلاتے ہیں۔ (تُبَع جمع ہے تابع کی)

سَنَد و مَتن حدیث کے دو حصّے ہوتے ہیں پہلے حصّہ میں روایت کرنے والوں کا نام بہ نام سلسلہ ہوتا ہے۔ اسے سَنَد کہتے ہیں۔ دُوسرے میں حدیث کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اسے مَتن کہتے ہیں۔

سَنَد حدیثِ نبوی کو راویوں نے ایک دوسرے سے سُن کر آگے پہنچایا ہے۔ دوسرے ہی طبقۂ رُواۃ میں یہ قاعدہ ہوگیا تھا کہ جب کوئی راوی حدیث بیان کرتا تو اپنے سے سابقہ تمام راویوں کے نام ایک لڑی کی صورت میں بیان کر دیتا تھا کہ میں نے فلاں سے سُنا، اس نے فلاں سے ...... تا آخر۔ راویوں کے اس نام بہ نام سلسلہ کو سَنَد کہتے ہیں۔ اسے اِسناد بھی کہا جاتا ہے۔ اسناد کے لغوی معنی ہیں تکیہ یا سہارا لینا یا اجزاء کو مکمل طور سے جوڑنا۔ اِسناد کا لفظ صرف سَنَد کے لئے نہیں آتا، بلکہ سَنَد بیان کرنے یا پڑھنے کے لئے بھی۔

سَنَد کو طریق (رستہ) اور وَجہ (رُخ) بھی کہتے ہیں۔ طریق کی جمع طُرُق ہے، اور وجہ کی اَوجُہ۔

سَنَدِ عالی و نازل جب کسی حدیث کی ایک سے زائد سندیں ہوں تو جس سَنَد میں نبی اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام تک واسطے کم ہوں وہ سَنَدِ عالی کہلاتی ہے، اور جس میں واسطے زیادہ ہوں وہ سَنَدِ نازل کہلاتی ہے۔

سَنَد کے مرحلے جس راوی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث چلتی ہے وہ سَنَد کی اصل کہلاتا ہے۔ سَنَد کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) ابتداء :۔ وہ راوی جو سَنَد بیان کرنے میں اوّلیں لیکن زمانہ کے لحاظ سے سب سے متاخر ہوتا ہے۔

(۲) وسط

(۳) اِنتہاء :۔ اصل سَنَد کو کہتے ہیں۔ یہ راوی چونکہ سَنَد کی ترتیب میں سب سے آخر مذکور ہوتا ہے، اس لئے سَنَد کی انتہاء کہلاتا ہے۔

مُعَنْعَن وہ حدیث ہے جس میں اَخْبَرَنِی (اس نے مجھے خبر دی) اور حَدَّثَنِی (اس نے مجھ سے بیان کیا) وغیرہ کے واضح الفاظ نہیں ہوتے، بلکہ سَنَد کو عَن فُلاں عَن فُلاں (فلاں کو فلاں سے اور اس کو فلاں سے پہنچی) ..... تا آخر کے غیر واضح الفاظ سے جوڑا جاتا ہے۔ اس قاعدۂ روایت کو عَنْعَنَہ کہتے ہیں۔ اس سے تعیین کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ حدیث رُوبرو سُنی گئی یا کسی ایسے راوی کے واسطہ سے پہنچی ہے جس کا نام سند میں محذوف ہے۔

روایت باللفظ اور روایت بالمعنیٰ حدیث کو یا تو بعینہٖ لفظ بہ لفظ ادا کیا جاتا تھا یا فقط اس کے معنی روایت کر دیتے تھے۔ لیکن ایسے الفاظ میں کہ صحتِ معنی میں فرق نہ آئے۔ لفظی روایت کو روایت باللفظ اور معنوی کو روایت بالمعنیٰ کہتے ہیں۔

ایک صحابیؓ نے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی خدمت میں عرض کی کہ ہم آپؐ کی حدیث سنتے ہیں لیکن اس کو لفظ بہ لفظ بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ حضورؐ نے فرمایا، جب تم حلال کو حرام اور حرام کو حلال میں نہیں بدلتے اور معنی ادا کر دیتے ہو تو کوئی حرج نہیں۔[1]

---

[1] جمع الفوائد۔ جلد اوّل باب روایۃ الحدیث د

صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے دور میں روایت بالمعنیٰ میں کوئی قباحت نہ تھی۔ وہ شریعت کے نکتہ دان اور مزاج شناس تھے، فرقِ الفاظ کے باوجود ادائے مطالب میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، تاہم ہر راوی کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ کم از کم قولی روایت میں الفاظ کی نقل بعینہٖ ہو۔ تابعین کے بعد ائمۂ حدیث ہر نوع کی روایات میں صرف روایت باللفظ کو قبول کرنے لگے، کیونکہ عہدِ رسالت سے جُوں جوں بُعد ہوتا گیا، غلطی کا احتمال بڑھ رہا تھا۔ جو روایات بالمعنیٰ بیان ہو چکی تھیں، آگے سے ان کی بھی لفظی پابندی ہونے لگی۔ ان میں سے جو معیارِ صحت پر پوری اُتریں انہیں کتبِ حدیث میں درج کر لیا گیا[1]۔

رِوایت و دِرایت

یہ دیکھنے کے لئے کہ روایت دُرست ہے یا نہیں علمائے حدیث اس کو دو زاویوں سے پرکھتے ہیں۔ اوّل اس کی سند کو جانچتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے کچھ اُصول وضع کئے ہیں جنہیں اُصولِ روایت کہتے ہیں۔ دوم متن پر تحقیقی نگاہ ڈالتے ہیں کہ اس میں کسی خامی یا عیب نے دخل تو نہیں پایا۔ اس غرض سے جو اُصول بنائے گئے ہیں انہیں اُصولِ درایت کہتے ہیں۔

اُصولِ دِرایت

دِرایت کے چند اُصول درج ذیل ہیں:

(۱) روایت نصِّ قرآنی کے خلاف نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے جب حضرتِ عمرؓ اور ان کے صاحب زادے عبداللہؓ کی یہ روایت بیان کی گئی کہ مُردہ پر نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے، تو حضرت عائشہؓ نے قرآنِ حکیم کی اس آیت کے پیشِ نظر اس سے انکار کیا لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی)[2]

۲۔ روایت سنّتِ متواترہ کے خلاف نہ ہو۔

---

[1] مقدمۂ مشکوٰۃ: وَالنَّقلُ بالمعنیٰ واقع فی الکُتُبِ السِّتَّۃِ وَغیرِھَا

[2] مسلم جلد ۳۔ باب المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ

(۳) روایت صحابۂ کرامؓ کے اجماعِ قطعی کے مخالف نہ ہو۔

(۴) روایت عقلِ سلیم کے منافی نہ ہو۔

(۵) کوئی ایسا محسوس و مشہور واقعہ بیان ہو کہ وقوع میں آتا تو اس کی روایت کرنے والے متعدد آدمی ہوتے، اس کا ایک ہی راوی ہو تو مقبول نہ ہوگی۔

(۶) روایت شریعت کے مسلّمہ اُصولوں کے خلاف نہ ہو[1]۔

(۷) روایت صحیح اور مقبول حدیث کے منافی نہ ہو۔

(۸) روایت قواعدِ عربیہ کے خلاف نہ ہو۔

(۹) روایت ایسی نہ ہو کہ اس کے معانی رکیک ہوں یا شانِ نبوت کے منافی ہوں۔

اُصولِ روایت

روایت کے اُصول میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ:

(۱) راوی کس حد تک قابلِ اعتماد یا قابلِ تردید ہیں۔ یہ ایک مستقل فن ہے جسے جرح و تعدیل کہتے ہیں۔

(۲) حدیث کے کتنے طُرُق ہیں اور راویوں کی تعداد کیا ہے؟

یہ بحث احادیث کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے: متواتر، مشہور، عزیز اور غریب جن کا ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا۔

(۳) کیا حدیث صراحت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچی ہے یا نہیں؟ اس اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ٹھہرتی ہیں: مرفوع، موقوف اور مقطوع، ان کی تعریفیں آگے چل کر آئیں گی۔

(۴) کیا حدیث کی سند متصل ہے؟ اتصال اور انفصال کے لحاظ سے حدیث کی تقسیم آگے آئے گی۔

عدالت

عدالت تقویٰ اور مُروّت ایسی نیک اور مستقل صفات کا ایک ہمہ گیر نام ہے۔ تقویٰ سے مُراد اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنا اور بُرائیوں سے

---

[1] اس اصول میں بہت اختلاف ہے۔

دور رہنا ہے۔ مُرُوّت سے مُراد ہے مردانگی یعنی شریفانہ اَخلاق اور شائستہ آداب وغیرہ
صاحبِ عدالت راوی کو عادل یا عُدُول کہتے ہیں۔

ضَبُط ضبط کے لفظی معنی ہیں یادداشت۔ اِصطلاحًا روایت کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے اور صحیح طور سے ادا کرنے کو ضبط کہتے ہیں۔ ضبطِ ظاہر سے مُراد ہے الفاظ کا بعینہٖ یاد رکھنا، اور ضبطِ باطن سے مُراد ہے معنی کا محفوظ رکھنا۔

روایت حفظًا یاد ہو تو اُسے ضبطِ صَدر کہتے ہیں اور اگر تحریر کر کے پاس رکھ لی تو اُسے ضبطِ کتاب کہا جاتا ہے۔

ضبط والے راوی کو ضابط کہتے ہیں۔ جس کا حافظہ کامل ہو اُسے تامُّ الضَّبط کہتے ہیں۔

ثقاہت عدالت اور ضبط کے مجموعہ کو ثقاہت کہا جاتا ہے۔ جس راوی میں یہ وصف پایا جائے اُسے ثِقہ کہتے ہیں۔ ثِقہ کی جمع ثِقات ہے۔

ثِقہ راویوں کی حدیث کا ایک عمومی نام قوِیّ ہے۔

جُرح یا طَعُن راوی کے اوصاف و خصائل کی تحقیق کے بعد اُس کے اُن عُیوب کا اظہار کرنا جو اس کی روایت کے قبول میں حارج ہوں جرح (یا طعن) کہلاتا ہے۔

تعدیل تعدیل کے لغوی معنی ہیں عادل ٹھہرانا۔ اصطلاحًا راوی کے اوصاف و خصائل کی تحقیق کے بعد یہ بتانا کہ راوی عادل ہے، تعدیل کہلاتا ہے۔

طَعُن در عدالت صحابہؓ کی عدالت میں طعن نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بارہ میں ایک مسلّمہ اُصول ہے کہ الصَّحابۃ کُلُّھُم عُدُول (سب صحابہؓ عادل ہیں)

راویوں کے دیگر طبقات پر مندرجۂ ذیل وجوہ سے جرح ہوتی ہے:

(۱) کِذب: یعنی حدیثِ نبوی میں عمداً جھوٹ بولنا۔

جس راوی سے زندگی بھر میں ایک بار بھی حدیثِ نبوی میں بالقصد جھوٹ ثابت ہو جائے اس پر ہمیشہ کے لئے کِذب کا داغ لگ جاتا ہے۔ وہ توبہ بھی کرے تو اس کی حدیث قبول نہیں ہوتی۔

(۲) اِتّہامِ کِذب: راوی کا عام گفتگو میں جھوٹا ہونا چاہے حدیثِ نبوی میں اس کا دروغ ثابت نہ ہو۔

(۳) فِسق: اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہونا یعنی کبیرہ یا نمایاں گناہوں کا ارتکاب کرنا۔[1]

(فسق اگر اعتقاد میں اجتہادی اختلاف کا مظہر ہو تو بدعت میں داخل ہوگا)

(۴) بدعت: دین میں رائے یا اجتہاد کی غلطی سے کسی ایسی بات کا قائل یا عامل ہونا جو مسلّمہ اُصولِ شرعی کے خلاف ہو۔[2]

(۵) جہالت: راوی کا مجہولُ الحال ہونا، یعنی اس کے حالات معلوم نہ ہوں اور لہٰذا اس کی جرح و تعدیل نہ ہو سکے۔

(مجہولُ الحال راوی کو مُبہَم بھی کہتے ہیں)

جَرح دَر ضَبط

حافظہ کی کمزوری یا فہم کی کمی سوائے پیغمبرؐ کے سب کو لاحق ہو سکتی ہے۔ صحابہؓ کی اکثریت ضابط تھی۔ البتہ بعض پر ضبط کی رُو سے جرح ہوتی ہے۔ راویوں میں حافظہ کی مندرجۂ ذیل خامیاں ہو سکتی ہیں:

(۱) فرطِ غفلت

(۲) کثرتِ اَغلاط

غفلت اَور غلطی میں اصطلاحی فرق یہ ہے۔ کہ غفلت کا تعلق سننے اور یاد رکھنے سے ہے

---

[1] اگرچہ جھوٹ بھی فسق ہی کی ایک شاخ ہے۔ لیکن اِصطلاحِ محدثین میں اسے فسق سے علیحدہ رکھا گیا ہے [2] بدعت دیدہ و دانستہ اور ضد سے ہو تو اسے کفر کہیں گے۔

اور غلطی کا حدیث ادا کرنے سے۔

(۳) مخالفتِ ثقاۃ اسناد و متن میں۔

(۴) وہم: یعنی راوی کا روایت کے وقت اپنے حافظہ پر اعتماد نہ رہنا۔

(۵) سُوءُ الحفظ: یعنی راوی کی غلطیوں کا اس کے صوابات[1] کے برابر یا زائد ہونا۔

(۶) اختلاط: راوی کا زندگی کے آخری حصہ میں بڑھاپے یا ضعف کے سبب سے ادائے حدیث نہ کر سکنا۔

ایسے راوی کو مختلط کہتے ہیں۔

تصحیح: حدیث کو صحیح قرار دینا۔

تضعیف: حدیث کو ضعیف قرار دینا۔

ظن: اِصطلاح میں گمانِ غالب کو کہتے ہیں۔

---

[1] صواب کا لفظ غلط کے مقابل ہے۔

اقسامِ حدیث

تقسیمِ اوّل :-

صحابہؓ اور تابعینؒ کے ایسے اقوال جو مُدرک بالقیاس ہوں یعنی جن کا مدار قرآن و سنّت کے قیاس پر ہو ان سے قرآن و سنّت کی توضیح و تشریح میں بہت مدد ملتی ہے۔ تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں اس قسم کے اقوال جو قابلِ سَنَد صحابہ و تابعین سے منقول ہوتے ہیں، اُن کو بھی حدیث ہی شمار کیا جاتا ہے۔

امتیاز کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کو حدیثِ مرفوع کہتے ہیں۔ جو صحابی پر منتہی ہو اسے حدیثِ موقوف اور جو تابعی پر منتہی ہو اسے حدیثِ مقطوع کہتے ہیں، ان کی تعریفیں حسبِ ذیل ہوں گی:

(۱) مرفوع : وہ حدیث ہے جس کی سَنَد نبی کریم علیہ الصلوٰۃ وَالسّلام تک منتہی ہو یعنی اس میں حضورؐ کا قول، فعل، تقریر یا صفت بیان ہو۔

حدیثِ مرفوع[ف۵] کی دو قسمیں ہیں :-

(ل) مرفوعِ صریح : جس میں صراحت ہو کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی یا فلاں کام کیا، یا آپؐ کی موجودگی میں کسی نے فلاں بات کی یا کہی اور آپؐ نے منع نہ فرمایا۔

(ب) مرفوعِ حکمی[ف۶] : اگر راوی کے بیان سے تخمیناً معلوم ہو کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ف۵ مرفوع میں متّصل اور منقطع کی سب اقسام شامل ہیں۔

ف۶ حکم سے یہاں مُراد ہے فیصلہ۔ مرفوعِ حکمی کے لغوی معنی یہ ہیں کہ تحقیق کے بعد فیصلہ ہوا کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔

کی حدیث ہے تو اسے حدیثِ حکمی کہیں گے۔

حدیثِ مرفوع کا اطلاق بالعموم نوعِ اوّل —— مرفوعِ صریح —— پر ہوتا ہے۔ نوعِ ثانی کے بارہ میں حکم لگانے کے لئے وسیع علم اور عمیق ہے اور فیصلہ میں اختلاف ہو سکتا ہے، اس لئے بعض علماء اسے حدیثِ مرفوع تسلیم نہیں کرتے۔

(۲) موقوف: جب کسی قابلِ سند صحابی کا قول، فعل یا تقریر بیان کردی جائے۔

(۳) مقطوع: جب کسی قابلِ سند تابعی کا قول، فعل یا تقریر بیان کردی جائے۔

تقسیمِ دوم:

(راویوں کی تعداد کے لحاظ سے)

(۱) متواتر: خبرِ متواتر وہ حدیث ہے، جس میں مندرجۂ ذیل شروطِ اربعہ پائی جائیں۔

(ا) راویوں کی تعداد کسی مرحلہ میں چار سے کم نہ ہو، بڑھ کر چاہے سینکڑوں کو پہنچ جائے۔ نیز یہ تعداد اتفاقاً اور بلا قصد میسّر آگئی ہو۔

(ب) سند کے سب مرحلوں میں تعدادِ رُواۃ کی یہی صورت ہو۔ کسی مرحلہ میں اتنی کم نہ ہو جائے کہ تواتر کے درجہ سے گر جائے۔

اِصطلاح میں اس وصف کو استواء کہتے ہیں۔

(ج) راویوں کی اس جماعت کے بارہ میں یہ خیال کرنا محال ہو کہ اس نے جھوٹ پر ایکا کیا ہے۔

(د) طبقۂ اوّل کے راویوں یعنی صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی دیکھا یا سُنا ہوا امر بیان کیا ہو۔ محض گمان یا عقلی دریافت سے کام نہ لیا ہو۔

(خبرِ متواتر میں فیصلہ کُن چیز راویوں کی کوئی مقرر تعداد نہیں ہوتی اور نہ ان کی جُداگانہ ثقاہت ہوتی ہے، بلکہ سامع کا وہ اطمینان ہے جو حدیث کے سننے پر

بے تامّل پیدا ہوتا ہے۔ بعض عُلماء نے اس اطمینان کو خبرِ متواتر کی پانچویں شرط قرار دیا ہے)۔

خبرِ متواتر کا علم قطعی ہوتا ہے۔ اس کی سَنَد اور راویوں کے اَحوال میں چھان بین نہیں ہوتی۔

(۲) مشہور (یا مستفیض): حدیثِ مشہور کے لیے راویوں کی تعداد متعین نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور ہے کہ تین سے کم نہ ہو اور برابر بڑھتی جائے۔ حدیثِ مشہور میں متواتر کی شرائط چہارگانہ کاملاً موجود نہیں ہوتیں۔ اس لیے اس پر قطعی اعتماد نہیں ہوتا بشُبہ کا احتمال رہ جاتا ہے۔

(۳) عزیز (لغوی معنی ہیں قلیل یا غالب): وہ حدیث جس کی سند کے ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہوں۔

(۴) غریب (یا فرد): وہ حدیث ہے جس کی سَنَد کے کسی مرحلہ میں فقط ایک راوی رہ جائے۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

(ا) فردِ مُطلَق: جس کی سَنَد کے ہر مرحلہ میں ایک ہی راوی ہو۔

(ب) فردِ نسبی: جس کی سَنَد کے کسی ایک مرحلہ میں ایک راوی رہ جائے۔

فردِ مطلق کی تقویت کسی دیگر حدیث سے نہیں ہوتی، لیکن فردِ نسبی کی فردیت فقط نسبتہً ہوتی ہے۔ یعنی کسی ایک جہت کی نسبت سے، اس کی مُؤیّد دیگر حدیث مل جاتی ہے۔

تقسیمِ سوم

(سَنَد کے اِتصال و اِنفصال کے لحاظ سے)

(۱) مُتّصِل : وہ حدیث ہے، جس میں مندرجۂ ذیل شرائط ہوں :
(أ) سلسلۂ سَنَد کے دوران میں کوئی راوی رہ نہ گیا ہو۔
(ب) کوئی راوی مجہول الحال نہ ہو۔
(ج) یہ ثابت ہو کہ ہر راوی نے اپنے شیخ یعنی استاد سے بہ راہِ راست سنا ہے۔

(۲) مُنْقَطِع : وہ حدیث ہے جس کا سلسلۂ سند شکستہ ہو یعنی اس میں اتصال کی شرائطِ سہ گانہ میں سے ایک یا ایک سے زائد شرطیں ناموجود ہوں۔

منقطع کی مندرجۂ ذیل انواع ہیں :

(أ) مُعَلَّق : وہ حدیث ہے جس میں راوی یا راویوں کا سقط[1] یا حذف ابتدائے سَنَد میں ہو۔

(ب) مُرسَل : وہ حدیث ہے جس میں سقط اواخرِ سند میں ہو یعنی اس صحابیؓ کا جس نے نبی اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی حدیث بیان کی ذکر نہ ہو اور اس سے سننے والا راوی —— صحابی ہو یا تابعی —— سند کو بہ راہِ راست حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچا دے۔

(ج) منقطع : وہ حدیث ہے جس کی سند کے اثناد میں مختلف مقامات پر ایک یا ایک سے زائد راوی محذوف یا مجہول الحال ہوں یا ان کا سماع اپنے شیخ سے بہ راہِ راست نہ ہو۔

(منقطع کی دو تعریفیں ہیں، ایک تو متصل کے مقابل یعنی غیر متصل کے معنی میں اور دوسرے غیر متصل کی ایک نوع کے طور پر۔[2])

(د) مُعْضَل وہ حدیث ہے جس کی سند کے درمیان کسی مقام پر دو راوی متواتر محذوف یا مجہول الحال ہوں یا ان کا بہ راہِ راست سَماع ثابت نہ ہو۔

---

[1] راوی کا گر جانا۔ رہ جانا۔ چھوٹ جانا۔

[2] مقدمۂ مشکوٰۃ

(د) مُدَلَّس : وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی کسی غرض سے اپنے شیخ (استاد) کا نام چھپانے کی کوشش کرے اور اس سے اوپر کے راوی کا حوالہ اس انداز سے دے گویا اسی سے حدیث سنی ہے[1]

تقسیمِ چہارم

(صحت و ضعف کے لحاظ سے)

(ا) صحیح : اس کی دو قسمیں ہیں :۔ صحیح لِذاتہٖ یعنی وہ حدیث جو بطورِ خود صحیح ہو اور صحیح لِغَیرِہٖ یعنی وہ حدیث جو کسی دیگر حدیث کی مدد سے صحت کے درجہ میں آتی ہو۔

(ا) صحیح لِذاتہٖ : وہ حدیث ہے جس کے راوی عادل اور تامُ الضبط ہوں، سند متصل ہو، اس میں کوئی خفیہ علّت (عیب) نہ ہو اور اپنے سے قوی تر حدیث کے مخالف نہ ہو۔

(ب) صحیح لِغیرہٖ : وہ حدیث ہے جس میں صحیح لِذاتہٖ کی شرائط میں سے کسی ایک کی کمی ہو لیکن یہ کمی کثرتِ طُرُق یعنی سندات سے پوری ہو جائے۔

(صحیح کا لفظ بالعموم صحیح لذاتہٖ کے لئے آتا ہے)

(ج) حَسَن :۔ یہ صحیح اور ضعیف کے بین بین ہوتی ہے، اس کی حتمی تعریف مشکل ہے۔

بعض علماء نے اس کی دو قسمیں قرار دی ہیں :

حَسَن لِذاتہٖ :۔ جس میں صحیح کی اور سب شرطیں پوری ہوں لیکن ضبط (فہم اور حفظ) کی کمی ہو۔

حَسَن لِغَیرِہٖ :۔ جس میں ردّ و قبول کی صفات متوازن ہوں لیکن کوئی خارجی قرینہ اس کے قبول کی سفارش کر دے۔

(حَسَن کا لفظ بالعموم حَسَن لذاتہٖ کے لئے آتا ہے)

---

[1] مُدَلَّس کی تین قسمیں ہیں۔ تعریف بالا مشہور ترین ہے۔

(د) ضعیف :- وہ حدیث ہے جو صحیح یا حسن کی شرائط پر پوری نہ اترے، یعنی:
غیر متصل ہو یا راوی عادل یا ضابط نہ ہوں یا اس میں کوئی علّت ہو یا اپنے سے قوی تر حدیث کی مخالف ہو۔

تقسیمِ پنجم

(عدالت میں طعن کی رو سے)

(۱) موضوع : وہ حدیث ہے جس کے راوی میں کذب کا ثبوت یا گمانِ غالب ہو۔
(موضوع اور ضعیف حدیث میں یہ فرق ہوتا ہے کہ موضوع حدیث جعلی ہوتی ہے، ضعیف جعلی نہیں ہوتی۔ اس کے راوی صادق ہوتے ہیں لیکن اصولِ تصحیح کے معیار پر پوری نہیں اترتی)

(۲) متروک : وہ حدیث ہے جس کے راوی پر کذب کا اتّہام ہو۔
(۳) حدیثُ المُبْہَم : وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی مجہول الحال ہو۔
(۴) حدیثُ المُبتَدِع : وہ حدیث ہے جس کا راوی مبتدِع یعنی بدعتی ہو۔
(۵) مُنکَر : وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی فاسق ہو۔
(مُنکَر کی اصطلاح وسیع ہے۔ اس کی مزید تعریف ذیل میں ہے)

تقسیمِ ششم

(ضَبط میں طَعن کی رو سے)

(۱) مُنکَر : وہ ضعیف حدیث ہے جو صحیح یا حَسَن کے منافی ہو (اس صورت میں منکر کی مخالف اور غالب حدیث کو معروف کہتے ہیں)

یا

وہ ضعیف حدیث ہے جس کا کوئی راوی فرطِ غفلت یا کثرتِ اغلاط کا مرتکب[1] ہو (یہ ثبوت معروف حدیثوں کی کثیر مخالفت سے ملتا ہے۔ ایسے راوی کو مہجورُ الحدیث کہتے ہیں)

(۲) شاذّ: وہ حدیث ہے جس کے راوی ثقہ ہوں لیکن ایسی حدیث کی مخالف ہو جس کے راوی ثقہ تر ہوں۔[2]

ثقہ تر راویوں کی حدیث کو محفوظ کہتے ہیں

شاذ اور منکرؔ میں قوت وضعف کا فرق ہے۔ شاذّ سند کے لحاظ سے قوی ہوتی ہے اور قوی تر کے مخالف۔ منکر ضعیف ہوتی ہے اور صحیح یا حسن کے مخالف۔

(۳) مُعَلَّل: وہ حدیث ہے جس میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں عیاں ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی ایسا پوشیدہ عیب کارفرما ہوتا ہے جس تک فقط ماہرینِ فن کی نگاہ پہنچ سکتی ہے۔

یہ علّت عام طور سے راوی کے وہم کا نتیجہ ہوتی ہے مثلاً وہ مرسل کو مرفوع یا منقطع کو متصل بنا دے۔

(ذیل کی اقسام میں حفظ کی خامی سے ادنیٰ تصرف ہوتا ہے۔ ان تصرّفات کا علم ثقہ احادیث کے مقابلہ سے حاصل ہوتا ہے)

(۴) مُدرَجُ الاِسناد: وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں کوئی چیز بڑھا دی گئی ہو مثلاً کسی راوی نے کوئی حدیث مختلف طریقوں سے سنی اور انہیں مخلوط کر کے ایک سند بنا دی۔[3]

---

[1] منکر کی حدیث کو جامع بنانے کے لئے اس کی تیسری تعریف جو تقسیم پنجم میں ہے شامل کی جا سکتی ہے۔

[2] شاذ کی ایک اور تعریف یہ بھی ہے کہ اس کا راوی ہمیشہ سوءِ حفظ کا شکار رہا ہو۔

[3] مقدمۂ مشکوٰۃ کی رُو سے اِدراج وہ ہے جو عمداً کسی غرض سے ہو۔

الفاظ کی کمی بیشی کو اِدراج کہتے ہیں۔

(۵) مُدْرَجُ المتن : وہ حدیث ہے جس کے متن میں کوئی الفاظ بڑھا دئے گئے ہوں۔

(۶) مزید فی متصل الاِسناد : جب دو سندوں میں سے ایک میں راوی زیادہ ہو اور ترجیح کا قرینہ میسّر ہو تو زائد راوی والی حدیث کو مزید فی متصل الاِسناد کہیں گے۔

(۷) مُضطَرَب : جب دو سندوں میں سے ایک میں زائد راوی ہو اور ترجیح قائم نہ ہو سکے تو حدیث مُضْطَرَب کہلائے گی۔

(۸) مقلوب : وہ حدیث ہے جس کی سند یا متن میں متضاد کلمہ بدل دیا گیا ہو مثلاً خَفِیَ (پوشیدہ ہوا) کی جگہ ظَهَرَ (ظاہر ہوا) یا کعب بن مُرّہ کے بجائے مُرّہ بن کعب ہو۔

(۹) مُصَحَّف : جب الفاظِ حدیث میں حروف کی شکل وہی رہے اور کسی جگہ نقطے بدل جائیں مثلاً سَ کو شَ کر دیا۔

(۱۰) مُحَرَّف : جب حدیث کے الفاظ میں کہیں حروف کا فرق آجائے مثلاً حفص کی جگہ جعفر۔

تقسیمِ ہفتم

(اختلاف و تائید کی رو سے)

(۱) مُحْکَم : وہ حدیث ہے جس کا تصادم کسی دیگر حدیث سے نہ ہو۔

(۲) متابع اور شاہد : وہ حدیث ہے جو فردِ نسبی کی تائید کرے متابع کہلاتی ہے۔ جس حدیث کی متابعت کی جائے اسے مُتابَع کہتے ہیں۔

اگر متابعت طبقۂ اصحاب میں ہو تو تائیدی حدیث کو شاہد کہتے ہیں۔[1]

---

[1] بعض کے نزدیک شاہد و متابع میں فرق یہ ہے کہ متابع باللفظ ہوتی ہے اور شاہد بالمعنی

بعض اصحاب علم شاہد و مُتابع کو ایک معنی میں لیتے ہیں۔
(حدیث کی کتابوں میں متابعات و شواہد تلاش کر کے ان کا موازنہ و مقابلہ کرنا اور دیکھنا کہ کتنا حصّہ درست ہے اعتبار کہلاتا ہے)

(۳) مختلفُ الحدیث : جب حدیث کا ظاہری اختلاف کسی دوسری حدیث سے ہو لیکن ان دونوں میں تطبیق ہو سکے۔

(۴) ناسخ و منسوخ : اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم دیا اور بعد میں اسے منسوخ فرما دیا تو پہلی حدیث کو منسوخ اور دوسری کو ناسخ کہیں گے۔

تقسیمِ ہشتم

(ردّ و قبول کی رو سے)

(۱) مقبول : وہ حدیث ہے جو رِوایت و دِرایت کے معیار پر پوری اتری اور قابلِ عمل ٹھہری۔

(۲) مردود : وہ حدیث ہے جو روایت و درایت کے اصول پر ٹھیک نہ اتری لہٰذا ناقابلِ عمل قرار پائی۔

(۳) مُتَوَقّفْ فِیہٖ وہ حدیث ہے جس میں ردّ و قبول کی شرائط مساوی ہوں اور اس کے واجب العمل ہونے کے بارے میں فیصلہ نہ ہو سکے۔ حکم کے لحاظ سے یہ مردود کے برابر ہوتی ہے :۔

اقسامِ حدیث ایک نگاہ میں

(۱) تقسیم بلحاظِ اصلِ سَنَد

- مرفوع
- موقوف
- مقطوع

(۲) تقسیم بلحاظِ عدَدِ رُواۃ

- متواتِر
- مشہور
- عزیز
- فرد (غریب)
  - فردِ مطلَق
  - فردِ نسبی

(۳) تقسیم بلحاظِ اِتّصال وانفصالِ سند

- مُتّصِل
- منقَطِع
  - مُعلَّق
  - مرسَل
  - منقَطَع
  - مُعضَل
  - مُدَلَّس

(۴) تقسیم بلحاظِ صحت وضعف

- صحیح
  - صحیح لغیرہٖ
  - صحیح لذاتہٖ
- حَسَن
  - حَسَن لغیرہٖ
  - حَسَن لذاتہٖ
- ضعیف

(۵) تقسیم بلحاظِ طعن در عدالت

- موضوع
- متروک
- حدیثُ المُبْہَم
- حدیث المبتدِع
- منکر

(۶) تقسیم بلحاظِ طعن در ضبط

- منکَر (مخالفِ معروف)
- شاذ (مخالفِ محفوظ)
- بلحاظِ کمی حفظ
  - مُدرَجُ الاِسناد
  - مُدرَجُ المتن
  - مزید فی متصل الاسناد
  - مضطَرِب
  - مقلوب
  - مُصَحَّف
  - مُحَرَّف
- مُعَلَّل

(۷) تقسیم بلحاظِ اختلاف وتائید

- محکَم
- متابِع
  شاہد
- مختلف الحدیث
- ناسخ ومنسوخ

(۸) تقسیم بلحاظِ ردّ وقبول

- مقبول
- مردُود
- مُتَوَقَّف فیہ

بابِ دُوُم

اہمیّتِ حدیث

حدیث قرآن کی نگاہ میں

انسان کی فطرت جہاں اسے اطاعت طلب کرنے پر اکساتی ہے وہاں اسے کسی نہ کسی چوکھٹ پر اطاعت پیش کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ انسان کی خِلقت میں حاکمیت کی جِبلّتوں کے ہمراہ محکومیت کی جِبلّتیں[1] بھی عمل پرداز رہتی ہیں۔ محکومیت کی جِبلّتیں نہ ہوں تو افرادِ انسانی میں اجتماعیت کا رنگ کبھی پیدا نہ ہو اور نہ حکومتوں کا نقشہ ابھر سکے۔ تقلید کا جذبہ انہیں جبلتوں کا ایک کرشمہ ہے مثلاً جیسے دیکھو لباس کی وضع اور فیشن کے آداب کا اسیر ہے۔

ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں میں تقلید کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ ذہین اور طبّاع افراد بعض اوقات کسی جدّت کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن اس جدّت کے بیخ و بُن کو دیکھو تو اس میں بھی تقلید کا رس جولاں نظر آئے گا۔ بغیر تقلید کے تو انسان ٹانگوں کے سہارے کھڑا ہونا بھی نہیں سیکھتا۔ جو بچے جنگل کے جانوروں میں پلتے ہیں وہ انہیں کو دیکھ کر ہاتھ پاؤں کے بل چلتے ہیں۔

انسانی فطرت کا کوئی جذبہ بے کار یا معیوب نہیں ہوتا۔ جذبات جب تک حدود کے اندر ہوں انسان کے لئے بہبود کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ تقلید اور اطاعت کیشی کے جذبات بھی جب تک واجبی حدود و قیود سے آگاہ رہیں انسان کی

---

[1] حاکمیت کی جِبلّتیں : INSTINCTS OF COMBAT & SELF-ASSERTION

محکومیت کی جبلّتیں : INSTINCTS OF SUBMISSION & GREGARIOUSNESS

انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معمار بن کر دکھاتے ہیں، افراد کو زندگی کا رشتہ تلاش کرنے میں مدد دیتے ہیں اور جماعتوں کو اتحاد اور ہم آہنگی عطا کرتے ہیں۔

تقلید زمانی ارتقاء میں ایک ربط اور تسلسل پیدا کرتی ہے۔ بالفرض آج تقلید کا جذبہ انسانی فطرت سے نابود ہو جائے تو ارتقاء کے قدم رک جائیں اور زندگی ساکن و جامد ہو کر رہ جائے۔ کوئی فکر یا تخیل بھی بظاہر کتنا ہی اچھوتا کیوں نہ ہو کاملاً جدید نہیں ہوتا۔ جستجو اور تحقیق سے کام لو تو اس کی جڑیں ماضی کی سطح کے نیچے پھیلتی نظر آئیں گی اور اگر تجسس کا نور تمہاری مزید رہنمائی کرے تو ماضی کے ظلمات میں تمہیں ایک سرمدی چشمۂ حیات نظر آئے گا جو قرن ہا قرن سے اس کی آب یاری کر رہا ہے۔ سائنس کی کوئی ایجاد نہیں جس کی بنیاد کسی سابقہ ایجاد پر قائم نہ ہو اور تہذیب و تمدن کا کوئی قصر نہیں جس کی بنیادیں آفرینشِ آدم کی کہنگی میں پیوست نہیں۔

دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے کلیتہً بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اگر اس نے ماضی میں کوئی ٹھوکر کھائی ہے تو یہ ٹھوکر بھی اس کے مستقبل کے لئے ایک درس بن جائے گی بشرطیکہ اس میں فکر و تدبر اور درس پذیری کا مادہ موجود ہو۔ مطالعۂ تاریخ کی اہمیت کا یہی راز ہے۔ تاریخ ماضی و حال کے ربط کو برقرار اور استوار رکھنے میں بہت ممد ثابت ہوئی ہے۔ اگر ماضی کا درس بالکل فراموش کر دیا جائے، تو ارتقاء کا سفر نئے سرے سے آغاز کرنا ہوگا۔

ایک قوم کی تاریخ صرف اس کے لئے نہیں بلکہ دوسری اقوام کے لئے بھی افادیت رکھتی ہے۔ بنو اسرائیل کی سرگزشت کو دیکھو، عروج و زوال کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے کچھ دانش دی ہے وہ اس سے ضرور سبق اندوز ہوگا، لہٰذا ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بنو اسرائیل کی روایات بےشک بیان کرو۔ ان میں کوئی حرج نہیں[1]

---

[1] دارمی

قرآنِ حکیم نے اپنے اختصار کے باوصف تاریخ کی بعض اہم کڑیوں کو اپنے اوراق میں محفوظ کرلیا ہے۔ بعض ایسی اقوام کی داستانیں بیان کردیں جو عروج کے درجۂ کمال پر پہنچیں لیکن جب اللہ تعالیٰ سے روگردان ہوئیں تو پستی کے عمیق و تاریک غاروں میں گر کر تباہ ہوگئیں۔ بعض سابقہ انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کے درخشاں واقعات بھی قرآن میں مذکور ہیں جو اہلِ ایمان کے دلوں کو ثبات و قرار عطا کرتے ہیں اور اخلاقی و روحانی ارتقاء کے لئے قوت فراہم کرتے ہیں۔

تاریخ اسی صورت میں درست رہنمائی کرتی ہے کہ اس میں واقعیت ہو۔ علمائے تاریخ روایات کی چھان بین میں عمریں کھپا دیتے ہیں تاکہ غلط روایات کی بیخ کنی ہو جائے اور قوم گمراہی سے بچ جائے۔ تاہم تاریخ غلط ہو یا صحیح، اقوام کو اس سے ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ وہ اپنے مشاہیر کی خدمت میں بے اختیار ہدیۂ عقیدت پیش کرتی ہیں۔ کوئی باحمیت اور بیدار مغز قوم اپنے مشاہیر سے تغافل نہیں کر سکتی۔ تاریخی شخصیت جس قدر کامل ہوگی عقیدت کا رشتہ اس سے اسی قدر زیادہ مضبوط ہوگا۔ جن ہستیوں نے انسانیت پر احسان کیا ہے ان کے مدارج مختلف ہیں۔ ان میں بلند ترین درجہ ان کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کا بے عیب نمونہ بنایا اور گناہوں سے معصوم رکھا۔ جہاں تک ان کے منصبی فرائض کی بجا آوری کا تعلق ہے ان کی فکر و بینش اور اقوال و افعال کو اپنی نگاہِ حفاظت میں رکھا اور اگر ان سے کوئی ادنیٰ کمی ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً درستی کردی۔ یہ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام تھے۔ ان کی رہنمائی ہر عیب سے پاک تھی اس لئے ان سے جو عقیدت رکھی جائے گی وہ تام اور مکمل عقیدت ہوگی جسے اصطلاحِ مذہب میں ایمان کہتے ہیں۔

انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگیاں انسانیت کے لئے ایک کامل اور

بے سقم معیار مہیا کرتی ہیں ۔ اس لئے ہر نبی کی امت پر اس کی کامل اطاعت فرض رہی ہے ۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (ہم نے ہر رسول کو اسی لئے بھیجا کہ اس کی پیروی کی جائے) (۴ : ۶۴)

سب انبیاء علیہم السلام ایک ہی قافلۂ نور کے شرکاء اور ایک ہی دین کے علمبردار تھے ۔ انسانی فطرت ایک ہے اور غیر متبدل اس لئے انسانی رہنمائی کے بنیادی اور کلی اصول بھی غیر متبدل ہیں ۔ ان بنیادی اور غیر متبدل اصول کا نام دین ہے جسے ہم اسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ چند دینی اصول یہ ہیں : اللہ کو ایک مانو ، اس کی عبادت کرو ، سچ بولو ، دیانت دار رہو وغیرہ ۔

آفرینشِ آدم سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء ع آئے اسی دینِ اسلام کے داعی تھے ۔ البتہ شریعتوں میں فرق رہا ہے ۔ شریعت ان فرعی قوانین و قواعد کا نام ہے جن کی نسبت فطرت سے نہیں بلکہ عادت سے ہوتی ہے ۔ عادت زمان اور ماحول کی پیداوار ہے ۔ زمانہ اور ماحول کے تغیر کے ساتھ فرعی قوانین بھی بدلتے رہے ہیں مثلاً دین کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو ۔ شریعت بتاتی ہے کہ اس عبادت کا طریق کیا ہے ۔ عبادت کے طریقے مختلف ازمان میں مختلف رہے ہیں ۔ زمان و مکان کے تقاضے تغیر پذیر رہے ۔ لہٰذا شریعتیں بھی بدلتی رہیں اور مختلف اقوام و ادوار کے لئے الگ الگ نبی آتے رہے ۔ ہر نبی گناہ سے پاک اور معصوم تھا ۔ اس نے دین کے جو اصول پیش کئے اور جس استقامت سے ان کی پابندی کی وہ قیامت تک سب اقوام کے لئے قابلِ پیروی ہے ۔ قرآنِ حکیم نے سابقہ انبیاءؑ کے بارہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرمایا ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط (ان کی ہدایت پر چل) (۶ : ۹۰) اور فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (۴۶ : ۳۵)

(اے نبی اولوالعزم رسولوں کی طرح ثابت قدم رہیے) ۔ اسلام اپنے ہر پیرو کے لئے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ سب انبیائے سابق پر ایمان رکھے ۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے ۔ ان کے نبی ہونے میں کوئی شک یا شبہ نہیں ۔ ان سے انکار کفر ہے ۔ اگرچہ ان کی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں لیکن ان کے اصولِ دین اور حسنِ عمل کی پیروی اب بھی واجب ہے ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کمال کے نقطۂ آخریں پر تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ذاتِ مبارک میں دنیا کے سامنے ایک مثال رکھ دی جو ہر لحاظ سے بے عیب اور اکمل و اَتم ہے ۔ اس میں مزید ترقی کا تصوّر نہیں ہو سکتا ۔ دنیا میں جو انسان بھی پیدا ہوگا ہزار بلند مقام ہو لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے بدرجہا نیچے ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تمام ادوار کے لئے اُسوۂ حَسَنہ یعنی بہترین نمونہ قرار دیا ہے ۔ آپؐ کو جو شریعت عطا کی وہ بھی اکمل و اُتم ہے اس کے بنیادی قواعد میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ۔ زمان و مکان کے تغیر اسے بے اثر نہیں کر سکتے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت آپؐ پر ختم کر دی ۔ قرآن شریف آپؐ کو خاتم النبیّین کہتا ہے ۔ رحمۃٌ للعالمین کے خطاب کا بھی یہی مفہوم ہے ۔ آپؐ سب جہانوں کے لئے رحمت ہیں ۔ ان جہانوں میں آپؐ کے بعد کے ادوار بھی شامل ہیں ۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انسانیت کے تمام پہلوؤں کی جامع ہے ۔ بے کسی اور غلبہ، دکھ اور سکھ کے سب انقلابات سے آپؐ گزرے اور ہر مرحلہ میں بنی نوع انسان کے لئے ایک مثالی نمونہ پیش فرمایا ۔ خانگی امور، کاروباری معاملات، تعلیم، ملکی انتظام، بین الاقوامی سیاست، فنِ جنگ، الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں آپؐ کی ذاتِ اقدس مشعلِ ہدایت ہے ۔

قرآن حکیم سابقہ انبیاءؑ کے بارہ میں بھی حکم دے رہا ہے: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط

پھر اس ہستی کا اتباع کیوں نہ مستقبل کے ہر دور کے لیئے جزوِ ایمان ہو جو مرقعِ صفات اور جامعِ کمالات تھی، جو ہر ضعف اور ہر عیب سے دُور تھی، جو ہر کثافت اور آلودگی سے پاک تھی، جس کی زندگی روحانی اور دُنیوی ہر پہلو سے ایک مُحیّر العقول معجزہ تھی۔ ہم اس پیکرِ شرف کے نقوشِ قدم کو کیسے فراموش کر دیں جس کی گردن کسی غیر کے آگے نہ جھکی، جس کی آبرو نے کبھی کوئی زخم نہ اٹھایا، جس نے کسی جنگ میں منہ موڑا اور نہ شکست کھائی، جو ایک وقت بے کسی کے عالم میں فقط ایک ہمراہی کے ساتھ اپنے شہر سے نکلا اور آٹھ برس کے بعد مسافرت کے عالم سے دس ہزار قدوسیوں کا تجلی ریز جلوس لے کر فاتحانہ جلال اور شفیقانہ جمال کے ساتھ اسی شہر میں رونق افزائے بزم ہوا۔ ہم اس شاہِ رسلؐ اور تاجدارِ انسانیت کی پیروی کو کیوں نہ سرمایۂ زندگی بنائیں جو ہر وصفِ تمام اور جوہرِ کمال سے ممتاز تھا؟ کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ ایسی ہستی کی پیروی وقتی اور ہنگامی تھی؟ کیا انسانیت کے جوہر کبھی پارینہ ہو سکتے ہیں؟ پھر اس پیکرِ کمال کو ہم (نعوذ باللہ) اگلے وقتوں کی پونجی کیوں قرار دیں جو سر تا پا انسانیت کی تجلی تھا؟

دو مبلغ تمہاری رہبری کا دعویٰ لے کر آتے ہیں۔ ایک خوش گفتار اور جادو بیان ہے۔ اس کے وعظ میں تاثیر اور نصائح میں طلسم ہے لیکن عمل کے لحاظ سے دیکھو تو صفر ہے۔ دوسرا شخص نہ صرف زبان و بیان اور وعظ و پند میں بے نظیر ہے بلکہ زبان سے جو کہتا ہے اس پر مُو بہ مُو عمل بھی کر کے دکھاتا ہے۔ تم ان میں سے کس کی پیروی کرو گے؟ لامحالہ دوسرے شخص کی جو علم و عمل دونوں کا پیکر ہے۔ پہلے شخص کو یہ کہہ کر جھٹلا سکتے ہو کہ تمہارے نصائح دل پذیر سہی لیکن ہم کیوں کر جانیں کہ یہ قابلِ عمل بھی ہیں؟ دوسرے شخص کی ہر بات عمل کی کسوٹی پر پرکھی جا چکی ہے اور تجربہ کے میزان میں پوری اتر چکی ہے۔ اس کو جھٹلانے کا تمہیں یارا نہیں ہو سکتا۔ پہلے مبلغ کا کام ہزار دلفریب سہی

لیکن دل فریبی کے باوصف عملی طور سے دقیق ہے اور شرح طلب۔ دوسرے شخص کا ہر سخن سورج کی کرن کی طرح صاف، شفاف اور مجلا ہے۔ پہلے شخص کی تبلیغ کو فقط کان سن رہے ہیں لیکن دوسرے کی تبلیغ کو نہ صرف کان سنتے ہیں بلکہ آنکھ بھی دیکھتی ہے لہٰذا اس کی ہر بات دل میں ڈوب جاتی ہے۔ یہ تبلیغ محض تبلیغ یا ابلاغ نہیں، بلکہ قرآن کے الفاظ میں بلاغ مبین یعنی بیّن کر دینے والا ابلاغ ہے۔ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مبارک قرآن کے بلاغِ مبین کا پیکر تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بَیِّنَہ یعنی بیّن نشانی کہا ہے۔ اگرچہ نبی کا بلاغ حقیقۃً بلاغِ مُبین ہی ہوتا ہے تاہم قرآنِ حکیم نے سات آیتوں میں تعیین سے بلاغِ مبین کا ذکر کیا ہے[1]۔ ایک آیت اصولی طور سے بتاتی ہے فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (رسولوں کے ذمے فقط بلاغِ مبین ہے) (۱۶ : ۳۵)

بلاغِ مبین کا فرض انجام دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اگر یہ محض فکری کاوشوں یا کلامی شعبدوں سے ممکن ہوتا تو کرسی نشین فلاسفر یا مسند آرا فقہاء ہی قوموں اور حکومتوں کی سربراہی سنبھالنے کے لئے کافی رہتے۔ بلاغِ مبین نبی ہی کا حصّہ ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بہ راہِ راست نگرانی میں یہ فرض نباہتا ہے۔ نبوّت محنت و مشقت کی کمائی نہیں، بلکہ قدرت کا عطیّہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا اس منصب پر سرفراز کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نبی کا روحانی اور عملی لحاظ سے نگہبان ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (۵۲ : ۴۸) (اے نبی آپ اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کریں آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:۔ إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰىكَ اللّٰهُ (۴ : ۱۰۵) (ہم نے آپ پر سچی کتاب اتاری، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی

---

[1] ۵-۹۲، ۱۶-۳۵ و ۸۲، ۲۴-۵۴، ۲۹-۱۸، ۳۶-۱۷، ۶۴-۱۲

رہنمائی میں فیصلے کریں) ان دو آیتوں ہی سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کی ذاتِ مبارک کا پاسبان اور اس کے تشریعی فکر و عمل کی درستی کا ضامن ہوتا ہے۔ رسول اللہ کی حیثیت میں اس کے ہر حرف اور ہر حرکت پر رضائے الٰہی کی چھاپ ہوتی ہے۔ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (اے نبی! (دشمن پر مشتِ خاک) آپ نے نہیں پھینکی تھی، اللہ نے پھینکی تھی)

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

لہٰذا نبی کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی[۲]) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (اے نبی کہہ دیجے کہ اگر واقعی تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں چاہے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا[۳])

اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنِ حکیم کی جمع و حفاظت کا ذمہ لیا ہے وہاں اس کے بیان کا ذمہ بھی اُٹھایا ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ ۝ (اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمّے ہے (اے نبی) جب ہم پڑھیں تو آپ اس کا اتباع کریں پھر ہمارے ذمّے اس کا بیان ہے[۴]) - بیان کے معنی ہیں بات کو کھول کر بتانا۔ قرآن کا بیان اللہ تعالیٰ نے جناب رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے انجام دیا۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۝ (ہم نے آپ پر قرآن اس لئے اتارا کہ آپ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کو لوگوں کے لئے کھول کر بیان کریں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔) (۱۶ : ۱۱)

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کا بیان کس طرح انجام فرمایا

---

[۱] نساء - ۸۰ [۲] آل عمران - ۳۱ [۳] قیٰمہ - ۱۷ تا ۱۹

اس کا جواب بھی قرآن خود دے رہا ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آل عمران ۱۶۴)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بہت کرم کیا کہ اُن میں انہی سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیات سناتا ہے۔ اُن کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے قبل واضح گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں جناب رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ چار فرائض بتائے گیے ہیں :

۱- اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی آیات سُنانا۔
۲- ان کا تزکیہ (یعنی روحانی پاکیزگی) انجام دینا۔
۳- کتابُ اللہ کی تعلیم دینا۔
۴- حکمت سکھانا۔

یہ چہارگانہ فرائض تبلاغ مُبِیْن تھے جن کے بغیر عرب کے لوگ ضلالِ مُبین میں تھے۔

جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا پہلا منصب اللہ تعالیٰ کی آیات سنانا تھا یعنی قرآنِ حکیم پہنچانا۔ فقط اتنا کام اللہ تعالیٰ فرشتوں سے بھی لے سکتا تھا۔ ان کے ہاتھ نہایت نفیس کاغذ پر طبع کی ہوئی کتاب کے لاتعداد نسخے بھیج دیتا تاکہ ہر انسان کے حصّہ میں ایک نسخہ آجاتا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّے کچھ اور فرائض بھی تھے جو فرشتہ کے بس کے نہیں اور نہ ایک عام انسان کی قدرت میں ہیں۔ اِن فرائض کو ایک کامل و اکمل اور معصوم فردِ بشر کی حیثیت میں فقط حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی انجام دے سکتے تھے۔ مومنین کا تزکیہ یعنی روحانی صفائی اور اس کے ساتھ قرآن و حکمت کی تعلیم ایک گراں بار فریضہ تھا۔ اس کی انجام دہی میں آپؐ کو جن شدائد اور مصائب سے گذرنا پڑا ان کے ذکر سے زہرہ گداز ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا کے کسی انسان نے میرے جتنی سختیاں نہیں اٹھائیں[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے ہر پہلو سے ایک اُسوۂ حسنہ یعنی بہترین نمونہ پیش کرنا تھا۔ دُکھ اور ابتلاء زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہت سے بھی ایک بے نظیر و بے مثال معیار قائم کیا اور صبر و استقامت کے درس کا ایک درخشاں باب مرتب فرما گئے۔ الغرض علم و عمل کا کوئی رخ اور کوئی گوشہ نہیں جس میں ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک کامل مثال قائم نہیں فرمائی۔ اپنے حبیبؐ کو پے در پے آزمائشوں سے دوچار کرنے میں اللہ تعالیٰ کی یہی حکمت نظر آتی ہے۔

کتابُ اللہ میں کئی ایسے احکام ہیں جن کی تعیین قولِ نبوی کے بغیر ناممکن ہے۔ مثلاً قرآن میں نماز کا حکم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اوقات، طریقِ ادا اور آداب وغیرہ سکھائے۔

قرآن میں زکوٰۃ اور اس کے مصارف کے احکام ہیں۔ اس کے دیگر قواعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام اشیاء کے بارہ میں ایک اُصول بتا دیا کہ طیّب یعنی پاکیزہ چیزیں حلال اور غیرِ طیّب حرام ہیں۔ چند مثالیں بھی بتا دیں اور مزید وضاحت یہ کہہ کر نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام تک چھوڑ دی۔ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (نبی ان کے لئے پاکیزہ چیزیں

---

[1] کنز العمال جلد ۶

حلال اور ناپاک اشیاء حرام ٹھہراتا ہے[1]۔) سورۃ النساء میں یہ بتا کر کہ فلاں فلاں رشتہ کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا کہہ دیا: وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ (۴: ۲۴) (اور حلال ہیں جو ان کے سوا ہیں) لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توضیح فرمائی ہے کہ کوئی عورت اپنی پھپھی یا ممانی کی سَوت نہیں ہو سکتی۔

قولِ نبوی کے بغیر قرآنی احکام سمجھنے میں کیا کیا غلطیاں ہو سکتی ہیں اس کی بعض مثالیں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی صادر ہوئی ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ وضو کے لئے پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔ ایک صحابیؓ کو تیمم کی کیفیت معلوم نہ تھی۔ ایک دفعہ انہیں پانی نہ ملا تو مٹی میں جا کر خوب لوٹیں لگائیں۔ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے انہیں تیمم کا طریقہ بتایا۔

نبی کی توضیحات قولی اور عملی دونوں لحاظ سے ہوتی ہیں۔ رسالت کے لئے بندوں کو انتخاب کرنے میں اللہ تعالیٰ کو یہی مصلحت منظور تھی کہ وہ ابنائے جنس میں منفس نفیس رہیں، اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہو کر دلیلِ راہ بنیں اور اپنے فیصلوں اور ہدایات کے ذریعے ایک فقہ یا شریعت کی تشکیل کر جائیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ فَاِنْ یَّکْفُرْ بِھَا ھٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِھَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِھَا بِکٰفِرِیْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰىھُمُ اقْتَدِہْ (یہ۔ انبیاء۔ وہ نفوس ہیں جنہیں ہم نے کتاب، شریعت اور نبوت دی اور اگر یہ لوگ ان باتوں کو نہ مانیں تو ہم نے ایسے لوگ مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے منکر نہیں، یہ (انبیاء) وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی سو تو ان کی راہ پر چل۔ (۶: ۹۰، ۹۱)

انبیاء کرام علیہم السّلام کے توسط سے کتاب اللہ کے بھیجنے سے مقصود یہ تھا کہ

---

[1] اعراف - ۱۵۷ ع

وہ اس کی قولی اور عملی تعبیر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور نگرانی میں کریں۔ شریعت کی تشکیل اور تکمیل کا یہی طریقہ ہے۔

ہر نبی کی شریعت دوسرے صاحب شریعت نبی کی بعثت تک قائم رہی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کر دئیے کہ قرآن کا بیان یعنی شریعتِ محمدیؐ آج چودہ سو برس بعد بھی کاملاً محفوظ اور روشن ہے۔ اس تاریخی حقیقت کا ثبوت آئندہ اوراق میں ملے گا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد جو شخص قرآنِ حکیم کی کوئی تشریح پیش کرے گا اس میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ وہ یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں نے کتاب و سنت کے خطوط پر اجتہاد کیا ہے، ممکن ہے، درست ہو، لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میری پیش کردہ تشریح بعینہٖ وہ بیان ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں لیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ایسے اصحابِ رسول کا یہ حال تھا کہ ان میں سے جب کوئی اپنے اجتہاد سے فتویٰ دیتا تو کہتا کہ اگر یہ فتویٰ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مقامِ رسالت قیامت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص ہو گیا ہے۔ یہ مقام نہ تو کسی کتب آموختہ اور فہم اندوختہ فرد کو مل سکتا ہے اور نہ اصحابِ خرد کے کسی ادارہ کو۔ جو بھی نیا مسئلہ اٹھے گا اس کا حل اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں تلاش کیا جائے گا۔ قرآن رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو فرض قرار دیتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں الرّسُول کی اطاعت کا حکم آیا ہے وہاں رسول سے مراد فقط حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ہم اس لفظ کو کوئی اور معنی نہیں پہنا سکتے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ..... اَلْاٰيت (اعراف - ۷ ۱۵)

یہاں اہلِ کتاب میں سے مشرف بالایمان ہونے والوں کے بارہ میں ارشاد ہے کہ وہ اس رسول کا اتباع کرتے ہیں جو نبی[1] اور اُمی ہے اور تورات و انجیل میں اس کا نام آیا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جو نبی اور اُمّی ہے جو اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کے تابع رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)۔ یہ آیت الرّسول کے معنی کی ایسی تعیین کر دیتی ہے جس سے ہم سرِمو انحراف نہیں کر سکتے۔ اگر ہم (نعوذ باللہ) فرض کریں کہ ایک مدت کے بعد رسول سے مُراد فلاں معیار کا کوئی عالم یا جمہوری ادارہ یا مرکز ہوگا تو آیاتِ مذکورہ کی رُو سے اس عالم یا ادارہ میں ان اوصاف کا ہونا لازمی ہے کہ

ا۔ اس کا ذکر تورات و انجیل میں آچکا ہو۔

ب۔ یہ نبوّت کا کام کرے۔

ج۔ اُمّی یعنی ناخواندہ ہو۔

قرآن حکیم میں جابجا اطاعتِ رسولؐ کا حکم ہے لیکن کوئی اشارہ بلکہ کنایہ تک نہیں کہ یہ اطاعت میعادی ہے، فلاں عہد، سنہ، ماہ یا تاریخ کے بعد اُسے منسوخ سمجھو۔ اس کے برعکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح الفاظ میں رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (یعنی سب جہانوں کے لئے رحمت) بتایا گیا ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

---

[1] نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا یعنی مستقبل اور آخرت کے بارہ میں

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان ۲۵ : ۱)

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ عالمین کو تنبیہ کرے (کہ برائی کا انجام برا ہے۔)

اس آیت میں قطعیت سے بتایا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب جہانوں اور تمام ادوار کے لئے نذیر ہیں۔ ہم (نعوذ باللہ) اپنے فیصلہ سے قرآنِ حکیم کی کسی آیت کو نہ منسوخ کر سکتے ہیں اور نہ اس کو ایسے معنی پہنا سکتے ہیں جو نسخ پر منتہی ہوں قرآن کے نسخ کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اگر ہم (نعوذ باللہ) یہ جرأت کریں تو اللہ تعالیٰ ہم سے فرمائے گا:

کیا تم کتاب کا ایک حصہ مانتے ہو اور ایک نہیں مانتے ؟ جو ایسا کرے اس کی سزا دنیا کی رسوائی ہے اور قیامت میں اس کو اس سے بھی بڑھ کر عذاب ملے گا۔[1]

اس کے برعکس اللہ کی تمام آیات پر ایمان ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے تو قرآن کی بشارت ہے کہ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا (اور جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے بہت بڑی مراد پالی)۔ (۳۳ : ۷۱)

سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عہد کی رہنمائی کرتی ہے۔ تسلیم کہ معاشرہ کے نو بہ نو مسائل اُٹھ رہے ہیں اور نئی نئی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن قرآن و حدیث نے کب دعوٰی کیا ہے کہ ہمارے پاس ہر جزوی مسئلہ کا بھی تیار شدہ حل موجود ہے۔ قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی کے لئے بنیادی اصول اور احکام

---

[1] یہ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

صادر فرمادئے ہیں - نئے مسائل ان کے خُطوط پر حل ہو سکتے ہیں - معاشرت و تمدن ہزار ترقی کر جائے اور اپنے ظواہر میں لاکھ ترمیم کر لے لیکن اس کے باطن میں آدمیت کی جو روح کارفرما ہے وہ اپنی اقدار کو بدلنے کی اجازت نہیں دے گی - یہ اقدار کیا ہیں؟ صحت، صفائی، سادگی، حیا، خلوص، یگانگت، مساوات، ہمدردی وغیرہ - معاشرت کے جو آداب و اطوار ان سے سازگار ہوں گے وہ ارتقاء کی علامت ہوں گے اور جو ان سے ناموافق ہوں گے وہ تنزل کے لقب ٹھہریں گے - روحانی اور مادی زندگی ہر دو کی اقدار زندہ رہتی ہیں - قرآن و سنت ان کے بارہ میں بنیادی اور اصولی احکام دیتے ہیں - اور زندگی کے ہر جزئیہ کو ہاتھ میں نہیں لیتے - زندگی کی جوئے رواں دوگونہ خواص رکھتی ہے - ایک تو سیّال ہونے کا وہ مُستقل خاصہ ہے جو اسے بھاپ کا بادل یا برف کا میدان بننے کے بجائے رواں دواں ندی کی صورت میں رکھتا ہے - اور دوسرا وہ ہر دم تغیّر پذیر خاصہ ہے جو اُسے بدلتے ماحول اور نئی گزرگاہوں سے موافق ہونا سکھاتا ہے - تغیّر پذیر عناصر مستقل جوہر سے بے ربط نہیں ہو سکتے - باہم وابستہ اور ہم آہنگ رہتے ہیں - کتاب و سنّت زندگی کے بنیادی اور مستقل جوہر کے بارہ میں اصول و قواعد عطا کرتے ہیں - لیکن زمانی اور مکانی تغیرات کو اُمت کے اجتہاد پر چھوڑ دیتے ہیں - اُمّت کا اجتہاد وہی بارآور ہوگا جو کتاب و سنت سے مربوط ہوگا۔

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبّہ کے دو پہلو تھے - ایک طبیعی اور دوسرا تشریعی[1] - طبیعی پہلو کا تعلق اس وقت کے خصوصی ماحول سے تھا - اس کی اطاعت واجب نہیں - تشریعی پہلو کا تعلق تبلیغِ رسالت سے تھا - یہ پہلو قرآن

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ کے ساتویں مبحث میں اس پر مفصل بحث ہے -

کی توضیح و تبیین کا حکم رکھتا ہے اُسے قرآنِ حکیم سے جداگانہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۲۱)	تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی حیاتِ طیبہ) میں (زندگی) کا بہترین نمونہ ہے۔(لیکن یہ اُسی کے لئے ہے) جو اللہ اور یوم آخر کی اُمید رکھتا ہے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سچے دل سے اللہ کا نام بار بار لینے والے اور اس کی اطاعت کا دم بھرنے والے وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسوۂ حسنہ مانتے ہیں ؛

حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں

سُنّتِ نبوی، اللہ کی جانب سے ہے

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی صرف قرآن کی صورت میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ دیگر پیرایوں میں بھی اُترتی رہی ہے۔ اس پر قرآنِ حکیم کی کئی آیات دلالت کرتی ہیں اور احادیثِ نبوی بھی۔ سورۂ انفال میں اہلِ اسلام سے خطاب ہے کہ بدر کی جنگ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا کہ (قریش کے جنگی یا تجارتی قافلوں میں سے) ایک گروہ پر تمہیں غلبہ ہوگا اور تم چاہتے تھے کہ وہ گروہ تمہارے سامنے آئے جس میں کھٹکا نہیں۔ یہ وعدہ قرآن میں نہیں، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام ہوا اور آپؐ نے اہلِ اسلام کو سنایا۔ قرآنِ حکیم اور حدیث شریف میں اس کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے کا طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی حضرت جبریل علیہ السلام کے توسط سے سکھایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہے کہ بندہ کے تمام افعال اس کے اپنے لئے ہیں لیکن روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا دیتا ہوں[1]۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام کے ذریعہ پہنچا۔ اس نوع کی دیگر احادیث بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وہ ارشادات بیان کرتی ہیں جو قرآنِ حکیم میں نہیں اور الہام سے نازل ہوئے۔ ان کو احادیثِ قُدسی کہتے ہیں۔ قیامت اور جنّت و دوزخ وغیرہ کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات ہیں وہ بھی آپؐ پر الہام ہی ہوئے تھے۔

وہ وحی جو کتابُ اللہ کی صورت میں آئی فقط نبی کا حصّہ تھا۔ لیکن الہام عام انسانوں کو بھی گاہے خواب میں اور گاہے قلب کے القاء سے ہو جاتا ہے۔

---

[1] مسلم کتاب الصیام (۳ : ۱۵۳)، بخاری

البتہ نبی اور غیر نبی کے الہام میں ایک واضح فرق ہے۔ غیر نبی پر الہام بہت کم ہوتا ہے اور اس سے لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن نبی کا الہام قطعی اور غیر مبہم ہوتا ہے اور کثرت سے نازل ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنِّی اُوْتِیْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ (مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ہمراہ اس کا مثل بھی)[۱] حضرت حسان بن عطیہ کا قول ہے کہ حضرت جبرئیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سنت بھی اس طرح لاتے تھے جیسے قرآن[۲]

اللہ تعالیٰ نبی کی حرکات و سکنات کا ہر لحظہ نگہبان اور محافظ رہا، اس لئے نبی کا ہر قول و عمل منجانب اللہ ہی تسلیم کیا جائے گا۔ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ ہم سے کبھی مزاح بھی کر لیتے ہیں۔ فرمایا، میری ہر بات حق ہوتی ہے[۳] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے آٹھویں برس شہر طائف کا محاصرہ کیا۔ محاصرہ طول پکڑ گیا۔ آپؐ نے ایک روز فرمایا[۴] کل ہم انشاء اللہ لوٹ چلیں گے۔ صحابہؓ آزردہ ہوئے اور کہا کہ کیا ہم فتح کئے بغیر چلے جائیں؟ فرمایا، اچھا کل جنگ کرو۔ دوسرے دن جنگ ہوئی تو خلافِ معمول کئی صحابہؓ زخمی ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کل ہم انشاء اللہ واپس چلیں گے۔ اب کے یہ بات صحابہؓ کو بہت پسند آئی۔ آپؐ یہ دیکھ کر ہنس دیئے صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اہم فیصلہ پر آزردہ سے ہوئے اس لئے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہو گئی۔

ہجرت کے چھٹے برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قومِ قریش سے ایک معاہدہ ہوا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس میں ایک شرط یہ ٹھہری کہ آئندہ جو شخص اسلام لا کر مدینہ جائے گا اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس قریش کے حوالے کر دیں گے۔

---

[۱] کنز العمال از شیخ علاؤ الدین، بحوالہ طبرانی کبیر ابوداؤد کتاب السنۃ
[۲] دارمی باب السنۃ قاضیۃ علی کتاب اللہ۔ [۳] شمائل ترمذی۔ [۴] بخاری کتاب المغازی

لیکن اگر کوئی شخص اسلام چھوڑ کر مکہ بھاگ جائے تو اسے نہیں لوٹایا جائے گا۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ چودہ سو صحابہؓ تھے۔ فداکاروں کی یہ تعداد قریش کو پیس ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس شرط کا بہت قلق ہوا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فیصلہ پر قائم رہے اور فرمایا، میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا اور نہ وہ میرا ساتھ چھوڑے گا[1] ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شرائطِ حدیبیہ کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے الہام ہوا۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ اس کے نتائج اُبھرنے لگے۔ قریش گھبرا اُٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہو کر التجا کی کہ ہم اس شرط سے باز آتے ہیں۔ آئندہ جو لوگ مکہ میں مسلمان ہوں آپ انہیں مدینہ بلا لیجئے۔ ہم نے فقط دو مثالیں دی ہیں، اور وہ بھی مختصراً۔ ایسی مثالوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوراقِ حیات معمور ہیں۔

سنت فقہ کا ایک ماخذ ہے رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کے ہمراہ سنت کو بھی فقہ کی ایک اصل قرار دیا ہے۔ اس بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہایت قطعیت اور تفصیل سے ہیں۔ مثلاً نماز کے بارہ میں فرمایا صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي یعنی میری نماز کی طرح نماز پڑھو۔ مناسکِ حج کے بارہ میں ارشاد ہے: خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ[2] (مجھ سے مناسک سیکھو) آپؐ کا فرمان ہے کہ جس نے حلال کی کمائی کھائی، سنت پر عمل کیا اور لوگ اس کی شرارتوں سے بچے رہے وہ جنت میں داخل ہوگا[3] ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے کہا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہم کیسے کر سکتے ہیں جب ہم آپؐ کے مساوی نہیں؟ یہ کلمات حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے تو آپؐ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میری پیروی کی کوشش کرو۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں[4] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا۔ روانہ

---

[1] طبری ۳: ۹، ۷ [2] مسلم کتاب الحج [3] ترمذی۔ ابواب صفۃ القیامۃ [4] مشکوٰۃ۔ بحوالہ بخاری و مسلم

کرتے وقت پوچھا، اگر تمہارے سامنے کوئی قضیہ آئے تو اس کو کیسے حل کرو گے؟ عرض کیا کہ اللہ کی کتاب سے حل کروں گا۔ فرمایا، اگر کتاب اللہ میں اس کا حل نہ ہو؟ جواب دیا، پھر سنت رسول اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا! آپؐ نے پھر پوچھا کہ اگر سنت میں بھی اس کا جواب نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذؓ عرض گذار ہوئے کہ پھر میں اپنی رائے سے کام لوں گا اور کوئی کمی نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کا سینہ ٹھونک کر فرمایا "شکر ہے اس اللہ کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کو رسول اللہ سے موافقت کی توفیق دی"[1]

حدیث کے بغیر امت میں انتشار پیدا ہو جائے

سنت قرآن کا بیان ہے اور اس کی توضیح کرتی ہے۔ حدیث کے بغیر قرآن کی توضیح درست نہیں ہو سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن میں (فقط اپنی رائے سے کام لے کر) ٹھیک نتیجہ پر پہنچ بھی جائے تو بھی وہ غلطی پر ہوگا[2] جس نے بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کی وہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرلے[3]

عقل اپنی حدود کو پہچانتی ہے لیکن عقلیت (عقل پرستی) حدود سے بے خبر ہوتی ہے۔ عقل پر سنت کا پہرہ نہ ہو تو یہ عقلیت میں بدل جاتی ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر فقط اپنی رائے سے کی جائے تو حد سے نکل جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ الفاظ تین بار دہرائے کہ مذہب کے معاملہ میں حد سے گزرنے والے لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں[4] اسے ہلاکت کیوں نہ کہا جائے جب کہ حدود شکنی ہی تمام اختلافات کی جڑ ہے؟ اگر لوگ سنت کے بغیر قرآن حکیم میں غور و خوض کرنے لگیں تو تفرقہ و انتشار کا وہ سیلاب اٹھے کہ امت غرق ہو کر رہ جائے۔ سنت اس سیلاب بلاکت پر بند باندھتی ہے۔ اور امت کو افراط و

---

[1] دارمی باب الفتیا ۔ الخ۔ ترمذی کتاب الاحکام۔ [2] ترمذی ابواب تفسیر القرآن
[3] ترمذی ابواب تفسیر القرآن۔ [4] ابوداؤد کتاب السنۃ

تفریط سے بچا کر امن و ترقی کی راہوں پر لگاتی ہے۔ اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱) جو شخص امت کے فساد میں میری سنت سے وابستہ رہے گا اُسے ایک سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔[۱]

(۲) ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ وقت آئے گا جب علم اُٹھ جائے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا، حضورؐ! جب قرآن کی تعلیم ہماری پشتوں میں تا قیامت جاری رہے گی تو علم کیسے اٹھے گا؟ فرمایا، کیا یہود و نصاریٰ تورات و انجیل نہیں پڑھتے؟ تاہم یہ لوگ نہیں جانتے کہ ان دو کتابوں میں کیا لکھا ہے۔[۲]

(۳) ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ فرمایا، جو میری اور صحابہ کی راہ پر ہوگا۔[۳]

(۴) ایک دن فجر کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا اثر انگیز خطبہ دیا۔ کہ سننے والوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں گریاں ہوگئیں۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور! یہ خطبہ الوداعی انداز رکھتا ہے۔ آپؐ ہمیں کوئی حکم دیجئے۔ فرمایا، میں تمہیں تقویٰ اور اطاعتِ امیر کا حکم دیتا ہوں چاہے تمہارا امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ میرے بعد تم جلد ہی کثیر اختلاف دیکھو گے، پس میری سنت اور میرے راست رو خلفاء کی سنت کو تھام رکھنا۔ اسے دانتوں سے پکڑ رکھنا۔ خبردار (روحِ دین سے نا آشنا) نئی چیزوں سے بچنا۔ کیونکہ (ایسی) ہر نئی چیز بدعت ہے۔ اور ہر بدعت ضلالت ہے۔[۴]

اسلام کی تاریخ بتا رہی ہے کہ امت میں فرقہ بندی ہوئی اور بعض عجیب و غریب عقائد کے گروہ اُٹھے۔ لیکن آج دنیا پر نظر دوڑاؤ۔ سوادِ اعظم انہی کا ہے جو سنت

---

[۱] مشکوٰۃ [۲] مشکوٰۃ بحوالہ مسند، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی [۳] ترمذی ابواب الایمان
[۴] ابوداؤد کتاب السنۃ۔ ابن ماجہ۔ ترمذی ابواب العلم۔ مستدرک حاکم کتاب العلم۔ دارمی

ٹوٹنے نہ پائے۔ ان میں بظاہر کچھ اختلافات نظر آتے ہیں۔ لیکن اصول میں کوئی اختلاف نہیں۔ فروع اور جزئیات کا اختلاف اہمیت نہیں رکھتا۔ اس اختلاف میں تصادم نہیں، بلکہ ایک منطقی ربط، یک رنگی اور ہم آہنگی ہے۔

سُنّت کی پیروی کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سنّت کے خلاف جانے سے روکا ہے اور قرآنِ حکیم اور اپنی سنتِ طیبّہ دونوں کی پابندی کا حکم فرمایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہماری سنت کے خلاف جو بات نکالی جائے وہ مسترد ہوگی[1]۔ فتحِ خیبر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھے اور درندوں کے گوشت کے حرام ہونے کا اعلان فرمایا۔ ان اشیاء کی تحریم کا ذکر چونکہ قرآنِ حکیم میں نہیں، اس لئے آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا، جان لو کہ مجھے قرآن اور اس کے مانند اور بھی احکام دیے گئے ہیں۔ عین ممکن ہے، کوئی پرشکم شخص تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور اس سے میری کوئی حدیث بیان کی جائے تو کہے کہ اللہ کی کتاب کو تھام لو۔ اس میں جو چیز حلال دیکھو اسے حلال جانو اور جو حرام دیکھو اسے حرام سمجھو۔ سن لو کہ پالتو گدھے اور شکاری درندوں کا گوشت تم پر حرام ہے[2]۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو دوام حاصل ہے۔ لہٰذا آپؐ کی سنّت کی پیروی تاقیامت فرض ہے جیسا کہ آپؐ کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ اس موضوع پر سابقہ اوراق میں بھی احادیث آچکی ہیں۔ ذیل کی احادیث اس مسئلہ میں مزید رہنمائی کرتی ہیں۔

(۱) میں اس شخص کے لئے بھی رسول ہوں جو اس وقت زندہ ہے اور اس کے لئے بھی جو بعد میں پیدا ہوگا[3]۔

(۲) میں فاتح و خاتم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مجھے کلمات کے جوامع اور فواتح ملے ہیں — میری

---

[1] ابو داؤد کتاب السنہ۔ اس حدیث کے دو راوی صحابی ہیں جن میں ایک حضرت عائشہؓ ہیں۔ [2] ابو داؤد کتاب السنہ ترمذی ابواب العلم۔ دارمی۔ ابن ماجہ۔ اس حدیث کے بیان کرنے والے صحابی مقدام بن معدیکرب، ابو رافع اور ایک اور صحابی ہیں۔ [3] کنز العمال جلد ۶ حدیث نمبر ۱۵۱۳ [4] کنز العمال ج ۶ حدیث نمبر ۱۶۲۲۔

حدیث مختصر ہے۔ تمہیں مضطرب الخیال لوگ ہلاک نہ کر دیں۔[۱]

(۳) میری تمام اُمّت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جو انکار کرے۔ حاضرین نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کون انکار کرے گا؟ فرمایا، جس نے میری اطاعت کی وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ جس نے نافرمانی کی، اس نے انکار کیا۔[۲]

(۴) جس نے میری سنّت سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبّت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنّت میں میرے ہمراہ ہوگا۔[۳]

(۵) جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا۔[۴]

(۶) جس نے میرے بعد میری کسی مردہ سنّت کو زندہ کیا اس کے لئے اتنا ہی ثواب ہوگا جتنا اس پر عمل کرنے والوں کے لئے بغیر اس کے کہ ان کا ثواب کم ہو اور اگر کسی ایسی بدعت کو کھڑا کیا جو اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے تو اس کی گردن پر اس بدعت کے پیروؤں کے مساوی گناہ ہوگا بغیر اس کے کہ ان کا گناہ کم ہو۔[۵]

ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ آئے ہیں کہ سنت کی دو نوعیں ہیں: تشریعی اور طبیعی۔ جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ تمیز فرمادی ہے۔ آپؐ نے سنت تشریعی کی دائمی پیروی واجب قرار دی ہے اور دیگر امور کے بارہ میں فرمایا ہے: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ (تم اپنے دنیوی کاموں کو بہتر جانتے ہو) امت کے لئے اس فرق کو ملحوظ رکھنا کچھ مشکل نہیں۔ بہرحال زندگی کا کوئی گوشہ ہو اس میں اصل روح کتاب و سنت ہی کی کارفرما ہونی چاہیے۔

اشاعتِ حدیث کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا علم آپ کی حدیث ہی سے ہو سکتا ہے اس لئے آپؐ نے حدیث کی بہت تاکید فرمائی ہے مثلاً

---

[۱] کنز العمال ج ۹ حدیث نمبر ۱۶۲۳۔ [۲] بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ [۳] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی [۴] ترمذی ابواب العلم [۵] ترمذی ابواب العلم

(۱) میری حدیث جیسی سنو ویسی بیان کر دو۔[۱]

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھ سے قرآن، علم اور وراثت کے قوانین سیکھو اور آگے سکھاؤ کیونکہ مجھے اس دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ علم جلد اٹھا لیا جائے گا اور فتنہ اُٹھے گا۔[۲]

(۳) تم میری حدیث سنتے ہو پھر یہ تم سے منقول ہو گی۔ پھر آگے روایت ہو گی۔ اس کے بعد آگے (اگلے طبقہ کو) پہنچائی جائے گی۔ پھر ایسے لوگ آئیں گے جو موٹے ہوں گے اور موٹاپے کے متمنی ہوں گے۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہو گی کہ پوچھے جانے سے پہلے بیان دیں گے۔[۳]

(مراد یہ کہ یہ تن پرست طبقہ محنت سے جی چرائے گا۔ تحصیلِ حدیث کی کوشش سے پہلو تہی کرے گا لیکن عالم کہلانے کا اس قدر شوق ہو گا کہ بغیر سوال کے اپنے فتوے اور فیصلے حاضر کریں گے)

(۴) ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپؐ کے خلفاء کون ہیں؟ فرمایا، جو میری حدیث کی روایت کریں گے اور اس کی تعلیم دیں گے۔[۴]

(۵) حجۃ الوداع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج تھا۔ اس میں ایک لاکھ کے لگ بھگ صحابہؓ موجود تھے۔ اس موقع پر آپؐ نے بعض مہتم بالشان خطبات ارشاد فرمائے۔ ان کے دوران میں آپؐ نے اشاعتِ حدیث کے بارہ میں بھی احکام صادر فرمائے جن میں سے آپؐ کے یہ فقرات یاد رکھنے کے قابل ہیں:

اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاد کام رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی اور دوسرے تک پہنچائی۔

---

[۱] المدخل از حاکم ص ۲۰ [۲] ترمذی ابواب العلم۔ مسلم کتاب القسامۃ... الخ [۳] ترمذی ابواب الدعوات

[۳] مستدرک حاکم کتاب العلم [۴] مقدمہ دارمی بحوالہ طبرانی اوسط

(میرے خطبہ کو) سننے والا غیر موجود آدمیوں تک پہنچائے۔ بارہا وہ آدمی جسے بات سنائی جاتی ہے سنانے والے سے زیادہ حافظہ کا مالک ہوتا ہے۔

(جس حدیث سے یہ فقرات لئے گئے ہیں اُسے سات آٹھ جلیل القدر صحابہؓ نے روایت کیا ہے۔)[۱]

(۶) فرمانِ نبوی ہے کہ جس شخص کو علم کی کوئی بات معلوم ہو، پھر اس سے پوچھی جائے اور وہ چھپا رکھے تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔[۲]

(۷) چالیس حدیثیں یاد کرنے کے ثواب کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیثؒ منقول ہیں (منتخب کنز العمال کتاب العلم)

حضرت ابوہریرہؓ کا شغل احادیثِ نبوی کا حفظ کرنا تھا۔ ان کا حافظہ پہلے کمزور تھا۔ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپؐ نے دعا فرمائی اور حضرتِ ابوہریرہؓ کا حافظہ قوی ہوگیا[۳] حضرتِ علیؓ کو بھی آنحضرتؐ نے حفظ کی دعا دی تھی۔ وہ حدیث اس طرح بیان کرتے کہ ایک لفظ تک چھوٹنے نہ پاتا۔[۴]

درسِ حدیث بعہدِ نبوی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابۂ کرامؓ نہایت ذوق و شوق سے حدیث یاد کیا کرتے تھے۔ زبانی ہی یاد نہیں کرتے تھے بلکہ لکھتے بھی تھے۔ اور ایک دوسرے کو حدیث کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

سُمُرہ بن جُندُب کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حینِ حیات میں میرا نوعمری کا عہد تھا۔ میں آپؐ کے اقوال ازبر کیا کرتا تھا[۵] احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدُ النّبیؐ میں صحابہ کے درمیان علم کی تدریس ہوتی تھی۔[۶] علم میں سنت بھی شامل ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ علم کی (بنیادی) انواع تین ہیں اور جو کچھ ان سے زاید ہے وہ فضیلت ہے۔ یہ تین نوعیں یہ ہیں: آیتِ محکمہ، سنتِ قائمہ اور

---

[۱] ترمذی ابواب العلم، مسلم کتاب القسامۃ [۲] ترمذی کتاب العلم [۳] بخاری کتاب العلم ترمذی
[۴] ترمذی احادیثِ شتّٰی [۵] مسلم کتاب الجنائز: جلد ۲ ص [۶] مثلاً دیکھو مستدرک حاکم کتاب العلم

فریضۂ عادلہ۔[1] ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد النبی میں تشریف لائے۔ وہاں صحابہؓ کے دو گروہ بیٹھے تھے۔ ایک اللہ کی یاد میں مصروف تھا، اور دوسرا تعلیم و تعلّم میں۔ آپؐ نے اس دوسرے گروہ کے بارہ میں فرمایا کہ یہ علم یافتہ سیکھ رہے ہیں اور بے علموں کو پڑھا رہے ہیں۔ اس لئے یہ افضل ہیں۔ مجھے بھی معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ کہ کر حضورؐ اسی گروہ میں بیٹھ گئے۔[2]

حضرتِ انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں بیٹھے ہوتے تھے۔ اور ہماری تعداد (بارہا) ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ حضورؐ کوئی حدیث بیان فرماتے اور پھر کسی کام سے چلے جاتے تو ہم اس حدیث کو باری باری دہراتے تھے۔ جب ہم اٹھتے تو یہ حدیث ہمارے دلوں میں گویا بوئی ہوتی تھی۔[3]

روایتِ حدیث میں احتیاط کا حکم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر اشاعتِ حدیث کی تاکید فرمائی ہے اسی قدر روایتِ حدیث میں احتیاط کا حکم بھی دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جس نے جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں تلاش کرلے) یہ حدیث متواتر ہے جس میں اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ اس میں یہ حکم نہیں کہ میری حدیث کی روایت مت کرو بلکہ یہ ہے کہ میری روایت میں جھوٹ نہ بولو۔ اس حکم سے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حدیث کی کس قدر عظیم اہمیت تھی۔ حدیث کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اس میں از بس احتیاط کی جائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ آدمی جو سنے آگے پہنچا دے۔[4] آپؐ کا منشا یہ تھا کہ حدیث بیان کرنے میں تحقیق سے کام لیا جائے۔

---

[1] ابن ماجہ [2] دارمی باب فضل العالم والمتعلم [3] مجمع الزوائد ۱: ۱۶۱ باب فی مدارسۃ العلم ومذاکرتہ [4] مقدمۂ صحیح مسلم

اور ہر کس و ناکس کی زبان سے حدیث سن کر اس کی تبلیغ نہ کی جائے۔

سالارِ انبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ سے منع کرنے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عوام میں ان احادیث کی اشاعت سے بھی روکا ہے جن کو صرف اہلِ علم اور خواص کا طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے صدقِ دل سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا اس پر اللہ تعالیٰ آگ حرام کر دیتا ہے۔ عوام کے ذہنوں میں صدقِ دل سے کلمہ پڑھنے کا مفہوم بٹھانا آسان نہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام میں اس حدیث کی اشاعت روک دی تھی تاکہ لوگ صرف کلمہ پر توکل کر کے بیٹھ نہ رہیں۔ حضورؐ کا فرمان ہے: اِتَّقُوا الْحَدِیْثَ عَنِّیْ اِلَّا مَا قَدْ عَلِمْتُمْ[۱] یعنی جو حدیثیں تمہاری سمجھ سے بلند ہیں ان میں نہ پڑو۔ عَلِمْتُمْ سے یہاں مراد فَہِمْتُمْ ہے۔ اس حدیث کی مزید شرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اگر لوگوں کو دُور از عقل حدیثیں سناؤ گے تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے[۲]۔ ایک عالم منصور نامی ایمانیات کے بارہ میں ایک حدیث بیان کرنے میں جھجک محسوس کرتے تھے تاکہ لوگ اسے غلط معنی پہنا کر غلط عقائد نہ گھڑ لیں (مسلم کتاب الایمان ۱: ۵۹)

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کا غیر ضروری مسائل میں پڑنا منظور نہ تھا۔ اس لئے آپؐ کثرتِ سؤالات اور قیل و قال سے ممانعت فرماتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے علم میں پختہ ہوئے بغیر فتویٰ دیا وہ اس کا گناہ بھگتے گا[۳]۔ جو شخص فتویٰ دینے میں سب سے بڑھ کر جری ہے وہ سب سے زیادہ آگ (میں پڑنے) کی جرأت کرتا ہے[۴]۔ اسی اصول کے تحت آپؐ کو حدیث کی کثرتِ روایت بھی ناپسند تھی۔ تاکہ لوگ عالم کہلانے کے شوق میں بے اختیار نہ ہو جائیں اور حدیثوں میں اغلاط گھڑ نہ کر جائیں۔ آپؐ کا حکم ہے کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے پرہیز کرنا۔ میرے متعلق جو کہو سچ اور حق کہو۔ جس نے میرے

---

[۱] ترمذی ابواب التفسیر۔ مسند احمد حدیث نمبر ۳۰۲۵۔ [۲] مقدمہ صحیح مسلم [۳] ابن ماجہ جلد ۱۔ باب اجتناب الرای والقیاس۔ دارمی۔ [۴] دارمی باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ

بارہ میں جھوٹ گھڑا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے[1]

حدیث کے باب میں حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے ایک اور احتیاط یہ ملحوظ رکھی کہ قرآن کے لئے حدیث کو یا حدیث کے لئے قرآن کو ترک نہ کیا جائے۔ دونوں اصلِ دین ہیں ان میں کوئی مغائرت نہیں۔ سابقہ سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس بات سے تاکیداً متنبہ فرمایا ہے کہ حدیث کو غیر ضروری سمجھ کر اس سے ہٹ نہ جائے۔ اب ہمیں حضورؐ کے نقطۂ نظر کو دیکھنا ہے کہ لوگ حدیث کی عقیدت میں اتنا نہ نکل جائیں کہ قرآن کو چھوڑ دیں۔

آنحضورؐ کا نظریۂ کتابت حدیث کے بارہ میں

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج شروع میں نہ صرف کم تھا بلکہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس طرف بہت توجہ دی لیکن اس باب میں زیادہ ترقی ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی ہو سکی۔ تاہم یہ مہم دنوں میں سر نہیں ہو سکتی تھی مسلمانوں کی ایک معتدبہ تعداد کو کتابت میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کچھ مدت درکار تھی اس دوران میں زیادہ انحصار حفظ ہی پر رہا۔ حضورؐ کے اس قول میں کہ نحنُ اُمَّۃٌ اُمیَّۃٌ لا نکتبُ ولا نحسبُ (ہم ایک ناخواندہ ملت ہیں نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں)[2] اسی دور کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

گزارے کے لئے لکھنا پڑھنا تو تھوڑی سی مدت میں آسکتا ہے۔ لیکن قرآن اور حدیث ایسی اہم چیزوں کو لکھنے کے لئے خاصی پختہ کاری کی ضرورت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احوال کے پیشِ نظر قرآن حکیم کی کتابت کے لئے کاتب مقرر کر رکھے تھے۔ سب سے زیادہ توجہ چونکہ اس طرف تھی کہ قرآن تحریری صورت میں آجائے اس لئے آپؐ نے انتہائی احتیاط سے کام لیا کہ لوگ کہیں قرآن اور حدیث کو یک جا لکھ کر غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے فرزندانِ توحید کو جو والہانہ شیفتگی تھی اس کے پیشِ نظر یہ اندیشہ لازمی تھا۔ حضرت ابو سعید خُدری فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابن ماجہ [2] جامع العلم ص ۳۵

کے اقوال تحریر کر رہے تھے۔ آپؐ تشریف لائے اور پوچھا، کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا، آپؐ کے ارشادات۔ فرمایا کتابُ اللہ کے ساتھ ایک اور کتاب لکھ رہے ہو؟ کتاب اللہ کو خالصًا لکھو۔ اس میں کوئی آمیزش نہ کرو۔ صحابہؓ نے یہ حکم سنا تو ایسی تمام تحریریں اکٹھی کر کے جلادیں۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ نے انہی اوراق میں حدیث بھی لکھ لی تھی جن میں انہوں نے قرآن لکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کو الگ لکھو۔ اور اس میں حدیث کی آمیزش نہ کرو۔ مخلوط نوشتے بہت غلط فہمی کا سبب ہو سکتے تھے۔ اس لئے نذرِ آتش کر دیے گئے۔ حضرت ابو سعید خُدری سے اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا کلام مت تحریر کرو۔ جس نے سوائے قرآن کے میری زبان سے سنی ہوئی کوئی بات لکھی ہے وہ اسے مٹا دے۔ میری حدیث بیان کرو۔ اس میں حرج نہیں اور جس نے جان بوجھ کر مجھ سے جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرے۔[۲] معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بھی اُسی واقعہ سے متعلق ہے جس کا ذکر پہلی حدیث میں آچکا ہے۔ یہاں بھی مقصود یہی ہے کہ قرآن کے اوراق میں جو احادیث لکھی گئی ہیں انہیں مٹا دیا جائے۔ اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کو خالص رکھو۔ اس میں سوائے کلامِ الٰہی کے اور کچھ نہ لکھو۔[۳] حضرت ابو سعید خُدریؓ سے ممانعتِ حدیث کی ایک اور حدیث بھی منقول ہے لیکن اس حدیث کے بارہ میں بعض محدثین جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اصولِ روایت پر پوری نہیں اترتی۔[۴] (صحابہؓ کی ان روایات پر مزید بحث کے لئے دیکھو صفحہ ۷۰)

تحریرِ حدیث سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتناعی احکام بعض خدشات سے مختص تھے۔ ورنہ آپؐ نے ہجرت کے دوسرے ہی برس حدیث کی ایک تحریر اپنے

---

۱ مسند احمد احادیث ابو سعید خدری
۲ صحیح مسلم کتاب الزہد و الرقاق
۳ ترجمہ مسند احمد۔ بحوالہ تاریخ اسلام از ذہبی
۴ فتح الباری ج اوّل، صفحہ ۱۴۹

پاس لکھوا کر رکھ لی تھی[1] عہدِ نبوی میں حدیث کا ایک ذخیرہ لکھا گیا تھا جس کا تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا۔ اجازتِ تحریر کے بارہ میں آپؐ کے ارشاد اس قدر واضح اور قطعی الثبوت ہیں کہ ان میں شک شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان میں سے بعض درجِ ذیل ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ یمن کے ایک شخص ابو شاہ نامی نے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھوا دیا جائے۔ آپؐ نے بعض صحابہ کو حکم دیا "ابو شاہ کو لکھ دو"[2]

ایک انصاری بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور کہا کہ مجھے حدیثیں یاد نہیں رہتیں۔ فرمایا "داہنے ہاتھ سے مدد لو اور اپنے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ لکھ لیا کرو"[3]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تحریرِ حدیث کی اجازت طلب کی تو فرمایا "قلب (یعنی یادداشت) کے ساتھ ہاتھ کی بھی مدد لو"[4]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیتے تھے۔ چند آدمیوں نے منع کیا اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ناراضی اور غصہ کی حالت میں بھی ہوتے ہیں اور تم ہر بات لکھ لیتے ہو۔ حضرت عبداللہ نے یہ بات سرکارِ نبوت میں عرض کی۔ حضورؐ نے فرمایا، لکھ لیا کرو۔ میں ہمیشہ حق بات کہتا ہوں[5] انہی ابن عمروؓ کا بیان ہے کہ ایک دن ہم حضورِ نبوی میں بیٹھے حدیثیں لکھ رہے تھے کہ حضورؐ سے کسی نے پوچھا، جناب! قسطنطنیہ کا شہر پہلے فتح ہو گا یا رومیہ؟ فرمایا "پہلے ہرقل کا شہر (یعنی قسطنطنیہ) فتح ہو گا"[6]

صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے[7] ان میں عبداللہ بن عمروؓ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت تقرب حاصل تھا۔ انہیں اعتراف تھا کہ عبداللہ بن عمروؓ مجھ سے زیادہ حدیثیں جانتے ہیں کیونکہ وہ

---

[1] ابن اثیر۔ طبری (تاریخ) [2] بخاری مترمذی (ابواب العلم)۔ مسند احمد [3] ترمذی کتاب العلم۔ جمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد [4] داری [5] دارمی۔ ابوداؤد کتاب العلم۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱۱ حدیث نمبر ۶۸۰۲، ۷۰۱۸۔

[6] دارمی۔ مسند احمد حدیث نمبر ۶۶۴۵ [7] سننِ دارمی

لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا[1]

اس موضوع پر چند مزید حدیثیں درج ذیل ہیں:

حضرت رافع بن خدیج نے حضورؐ سے پوچھا کہ ہم آپؐ سے کئی باتیں سنتے ہیں۔ کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا، کوئی حرج نہیں، لکھ لیا کرو[2]

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو قید میں لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ علم کو قید میں لانے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا، اس کا تحریر کرنا[3]

جس نے میری زبان سے سن کر علم کی بات یا حدیث لکھی تو جب تک اس علم و حدیث کا بقا ہوگا اس شخص کو اجر ملتا رہے گا[4]

علماء کے اٹھ جانے سے قبل علم تحریر کر لو۔ علم علماء کی موت کے ساتھ جاتا رہے گا۔[5]

جس نے میری چالیس حدیثیں اس امید پر تحریر کیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اسے مغفرت عطا کرے گا۔ اس کی بخشش ہو جائے گی اور اسے شہداء کا ثواب ملے گا[6]

جب حدیث لکھو تو اسناد کے ساتھ لکھو۔ اگر حدیث درست ہوئی تو ثواب میں سب شریک ہوں گے۔ ورنہ گناہ بیان کرنے والے کی گردن پر ہوگا[7]

حدیث صحابہ کرامؓ کی نگاہ میں

صحابۂ کرامؓ کی سنتِ نبوی سے شیفتگی

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نگاہ میں سنتِ نبوی کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس دور میں مشکل ہے۔ صحابہؓ کو جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک حرکت و ادا سے

---

[1] بخاری کتاب العلم، ترمذی کتاب العلم۔ مسند احمد جلد ۱۲ حدیث نمبر ۷۳۸۳۔ دارمی۔ [2] التقیید و الایضاح حافظ زین العابدین ص ۱۷۰۔ [3] مستدرک حاکم کتاب العلم۔ [4] کنز العمال ج ۵ حدیث نمبر ۴۲۳۴۔ [5] کنز العمال ج ۵ حدیث نمبر ۴۲۶۱۔ [6] منتخب کنز العمال برحاشیہ مسند احمد کتاب العلم ج ۵ ص ۵۷ [7] منتخب کنز العمال کتاب العلم۔ بغیۃ الوعاۃ سیوطی۔ آخری فصل۔

والہانہ الفت تھی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک دفعہ آخرت کے بارے میں ایک حدیث روایت کی اور ہنس دیے۔ وجہ یہ بتائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس حدیث کے بیان فرمانے کے بعد خندہ فرمایا تھا[۱] حضرت علیؓ ایک دفعہ گھوڑے پر بیٹھے اور ہنس دیے۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھوڑے پر بیٹھ کر ہنستے دیکھا ہے[۲] حضرت ابوبکرؓ ایک دن منبر پر کھڑے ہو کر رو دیے اور فرمایا کہ حضورؐ جب پہلے برس منبر پر کھڑے ہوئے تھے تو رو دیے تھے[۳]

صحابۂ کرامؓ کی سنت سے فریفتگی صرف جذبات عقیدت کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ اس کا ایک اور بھی قوی محرک تھا۔۔ اور وہ تھا عقل و ادراک کا تقاضا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ علم میں حکمت کی تحصیل کی تھی۔ آپؐ نے انہیں سنت کے دائمی اور عارضی پہلوؤں میں امتیاز سکھا دیا تھا صحابہ کرامؓ نے اس امتیاز کو ملحوظ رکھا۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات میں مستورات نماز کے لئے مسجد میں جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں منع کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اگر حضورؐ بھی اس وقت ہوتے تو مستورات کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیتے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت خطاب کیا کہ میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے۔ نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھتا تو میں بھی نہ چومتا[۴] لیکن حجر اسود کا بوسہ چونکہ اسلام کا ایک شعار ہے، اس لئے آپ نے اس پر عمل جاری رکھا۔ ایسی ہی رسوم سے متعلق جن میں ایک سطح بین نظر کو شاید کوئی فائدہ نظر نہ آئے حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جو کام ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کرتے تھے اسے نہیں چھوڑیں گے[۵]

---

[۱] مسلم کتاب الایمان [۲] ترمذی ابواب الدعوات۔ [۳] ترمذی ابواب الدعوات

[۴] ابو داؤد کتاب المناسک۔ مسلم کتاب الحج۔ بخاری کتاب الحج

[۵] سیرت عمر ابن جوزی ص ۱۹۶۔ ابو داؤد کتاب المناسک میں یہ قول رمل کے بارہ میں ہے۔

صحابۂ کرامؓ سنّت کی راہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اس لئے آپؐ نے امت کو آسمانِ شریعت کے ان درخشاں ستاروں سے ہدایت یاب ہونے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی تھی صحابۂ کرامؓ سنتِ نبوی کو ہدایتِ ربانی ہی تسلیم کرتے تھے اور اسے قرآنِ حکیم کی صحیح تعبیر مانتے تھے۔ ایک صحابیؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبیؐ کے لیے ہدایت کی سُنَن جاری فرمائیں اور نمازیں بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں[1] حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ نے ایک دفعہ کہا کہ جو عورتیں چہروں میں خال و خط بنواتی ہیں، بال چُنواتی ہیں یا دانت رتواتی ہیں اور اس طرح خود آرائی کی خاطر اللہ کی تخلیق کو بدلتی ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ ایک عورت اُمِ یعقوب نام نے جو قرآنِ شریف کا مطالعہ رکھتی تھیں یہ بات سنی تو حضرت ابنِ مسعودؓ کے پاس آئیں اور پوچھا کہ آپ نے یہ بات کہی ہے؟ ابنِ مسعودؓ نے جواب دیا کہ جس پر اللہ کے رسولؐ نے لعنت کی ہو میں اس پر کیوں نہ لعنت بھیجوں جب کہ اس کا حکم قرآن میں بھی ہے۔ اُمِ یعقوب نے کہا کہ میں نے قرآن شروع سے آخر تک پڑھا ہے لیکن یہ بات کہیں نہیں دیکھی۔ ابنِ مسعودؓ نے کہا کہ اگر تم نے واقعی قرآن پڑھا ہوتا تو اس میں یہ الفاظ دیکھتیں: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (اور جو دے تم کو رسول اللہ وہ لے لو اور جس سے منع کرے چھوڑ دو)[2] (۵۹: ۷)

ایک شخص نے عمرانؓ بن حُصین صحابی سے کہا کہ آپ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کی اصل ہمیں قرآن میں نظر نہیں آتی۔ حضرت عمران ناراض ہوئے۔ اور فرمایا، کیا تم نے زکوٰۃ کا نصاب اور فلاں فلاں شرحیں قرآن میں دیکھی ہیں؟ اس نے کہا، نہیں۔ عمران بولے، پھر کس سے معلوم کیں؟ ہم سے اور ہم نے نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے۔[3] خلفائے راشدین کی بیعت کتاب و سنت کے اتباع کی شرط پر ہوتی تھی۔ فقہ کے جس قدر امورِ پیش آتے تھے اگر ان کا حل کتاب اللہ میں نہ ملتا تو پھر حدیثِ نبوی میں تلاش کرتے تھے۔

---

[1] مسلم کتاب الصلوٰۃ [2] مسلم کتاب اللباس والزینۃ [3] ابو داؤد کتاب الزکاۃ

حضرت ابوبکرؓ کے پاس کوئی قضیہ آتا اور اس کا حل کتابُ اللہ میں نہ پاتے اور نہ اس باب میں کوئی حدیث یاد ہوتی تو باہر جاکر لوگوں سے حدیث پوچھتے تھے۔ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو کہتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم میں ایک ایسا شخص پیدا کر دیا ہے جو ہمارے دین کی حفاظت کرتا ہے[۱] یہی مسلک حضرت عمرؓ کا تھا۔ عہدہ داروں کو بھی انہوں نے ہدایت کی تھی کہ مقدمات کا حل سب سے پہلے قرآن اور سنت میں ڈھونڈیں۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو دیت کا ایک مقدمہ پیش آیا۔ آپ کو نہ قرآن سے اس کے فیصلہ میں مدد ملی اور نہ اس موضوع پر کوئی حدیث یاد تھی۔ حج کے دن تھے۔ آپ نے ایک اجتماع میں حاضرین کو قسم دے کر کہا کہ جس کے پاس دیت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہو وہ مجھ سے بیان کرے[۲]۔ ایک دفعہ صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کہ فتنے کے بارے میں کس کس کو حدیثیں یاد ہیں (مسلم کتاب الایمان)

صحابۂ کرامؓ اس بات کو روا نہیں جانتے تھے کہ کوئی شخص حدیث نبوی سے بے پروا ہو کر قرآن میں عقل دوڑائے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ خبردار اصحابِ رائے (دین کے) پوشیدہ دشمن ہیں۔ حفظِ حدیث سے قاصر رہے تو اپنی رائے سے فتویٰ دینے لگے۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور دیگروں کو بھی گمراہ کیا[۳]۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن میں شبہات پیدا کر کے تمہارے ساتھ جھگڑیں گے۔ ایسے لوگوں پر سنت کی مدد سے گرفت کرو۔ اصحابِ سُنن ہی کتابُ اللہ کے سب سے بڑے عالم ہیں[۴]۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ علم کے قبض ہونے سے پہلے اسے حاصل کر لو۔ علم کا قبض ہونا کیا ہے؟ علماء کا اس دنیا سے اُٹھ جانا۔ تمہیں کیا معلوم کہ علم کی کب ضرورت آپڑے۔ تم جلد ایسے لوگوں کو دیکھو گے جن کو گمان ہوگا کہ وہ قرآن کے داعی ہیں لیکن درحقیقت وہ اس سے برگشتہ ہوں گے[۵]

---

[۱] ریاض النضرۃ ج ۱ ص ۱۳۶ ؛ [۲] موطا امام مالک کتاب العقول ؛ [۳] سیرت عمر از ابن جوزی ص ۱۳۶
[۴] دارمی باب اتباع السنۃ ؛ [۵] دارمی باب اتباع السنۃ ، تذکرہ ذہبی ص ۱۴ -

(حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کی یہ پیش گوئیاں درحقیقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی ہیں جو سابقہ اوراق میں آ چکی ہیں)

اشاعتِ حدیث پر تاکید

اشاعتِ حدیث کے بارہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے چند اقوال درجِ ذیل ہیں:

حضرتِ عمرؓ۔ جس نے حدیث بیان کی اور اس پر عمل ہوا تو اُسے بھی اجر ملے گا[1]

جس طرح قرآن کا علم حاصل کرتے ہو اسی طرح سُنَن، علمِ وراثت اور لحن (یعنی تلفظ) کا علم بھی حاصل کرو[2]

آپ کی مرویات کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے۔ آپ سے صرف دس صحابہؓ نے زیادہ روایت کی ہے۔ (کتاب الاحکام ابن حزم ۲-۱۳۹)

حضرتِ علیؓ حدیث کو مل کر دہراتے رہو ورنہ بھول جاؤ گے[3]

حضرتِ ابوسعید خدریؓ - حدیث ہمیشہ باہم گر دہراتے رہو کیونکہ حدیث کا ذکر حدیث کو بیدار کرتا ہے[4]

حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ - حدیث کا اپنے درمیان دَور کرتے رہو کیونکہ حدیث یاد رکھنے سے زندہ رہتی ہے[5]

حضرتِ عثمانؓ اور حضرتِ ابوہریرہؓ روایت حدیث کو قرآن مجید کی اِس آیت کی رُو سے لازمی جانتے تھے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (بقرہ - ۱۵۹) (جو لوگ چھپاتے ہیں ہمارے اتارے ہوئے واضح احکام اور ہدایت بعد اس کے کہ ہم ان کو کتاب میں واضح کر چکے ہیں ان پر لعنت ہے اللہ کی اور سب لعنت کرنے والوں کی[6]

---

[1] جامع بیان العلم [2] سیرت عمر از ابن جوزی ص ۱۲۶ [3] مستدرک حاکم کتاب العلم [4] مستدرک حاکم کتاب العلم [5] مستدرک حاکم کتاب العلم [6] بخاری کتاب الوضوء و کتاب العلم، مسلم کتاب الطہارت۔

صحابۂ کرامؓ نے حدیث کی تعلیم و تدریس کا خصوصی اہتمام کیا۔ بعض سرکردہ صحابہؓ مفتوحہ علاقوں میں قرآن و حدیث کا درس دینے کیلئے نقل مکانی کر گئے۔ حضرت عمرؓ نے زندگی کے آخری خطبہ میں فرمایا تھا کہ میں نے امراء کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو دین و سنّت کی تعلیم دیں[1]

صحابۂ کرامؓ بعض دفعہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیۓ دور و دراز کا سفر کرتے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ایک حدیث کے لئے مصر کا اور حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے شام کا سفر کیا[2]

روایتِ حدیث میں احتیاط حدیث دین میں اساسی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے اس کی روایت میں از بس احتیاط کی ضرورت ہے۔ سُنَن (وہ احادیث جن کا تعلق ایمان اور اعمال سے ہے) کی اشاعت پر بہت تاکید تھی۔ لیکن دیگر احادیث کے بارہ میں جن کا تعلق فضائل اور فِتَن وغیرہ سے ہے کثرتِ روایت سے روکا جاتا تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ اگر تم نے لوگوں سے ایسی حدیثیں بیان کیں جو اُن کے فہم سے بعید ہیں تو بعضوں کے لئے ایک فتنہ ثابت ہوں گی[3] حضرت علیؓ بھی ایسی احادیث کی اشاعت سے روکتے تھے جو عوام کی سمجھ سے بالا ہوں[4] حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ میں نے علم کا آدھا حصّہ بیان کیا ہے۔ دوسرا حصّہ بتاؤں تو گلا کٹ جائے[5] علماء کی رائے ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو احادیث بیان نہیں کیں ان کا تعلق فِتَن وغیرہ سے تھا۔ حضرت عمرؓ بھی ایسی احادیث کی کثرت سے روکتے تھے۔ اس وقت اسلام کا ابتدائی اور بنیادی دور تھا۔ انتظامی اور سیاسی مہمات صف در صف کھڑی تھیں۔ ان سے منہ موڑ کر مابعد الطبیعاتی وغیرہ مسائل

---

[1] سیرت عمر از ابن جوزی ص ۷، ۱۹۔ مسلم کتاب المساجد ج ۲ ص ۸۱ ۞ [2] جامع بیان العلم ص ۴۶
[3] مقدمہ صحیح مسلم ۞ [4] تذکرۃ الحفاظ۔ فتح الباری جلد اوّل صفحہ ۱۶۰ ۞ [5] بخاری۔ تذکرہ ذھبی ۞

میں الجھنا ہی قوتوں کو شل کر دیتا ہے۔ عراق کے ایک شخص عبداللہ صبیغ نامی حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور قرآن کی ایک متشابہ آیت کے بارہ میں سوال کیا۔ حضرت عمرؓ نے کھجور کی چھڑی سے وہ جواب دیا کہ سائل کو ایسے مسائل سے توبہ کرتے بنی[۱]۔ تگ و تاز کے ان ایام میں علماء محض علماء نہ تھے بلکہ شمشیر بہ کف مجاہد بھی تھے کسے مہلت تھی کہ عقلی موشگافیوں پر مائل ہو؟ فقہ کے فرضی مسائل کو چھوتے تک نہ تھے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ سے ایک دفعہ کسی نے ایک فرضی مسئلہ پوچھا۔ آپ نے جواب دینے سے دوٹوک انکار کیا[۲]۔

سُنَن کی تعداد زیادہ نہیں اور وہ بھی اکثر عملی صورت میں منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ اُس وقت اسناد کے سلسلے بھی نہ تھے، اس لئے سُنَن کا حفظ کرنا مشکل نہ تھا۔ لیکن دیگر احادیث کی کثرت ہو جاتی تو لوگ حفظِ قرآن سے غافل ہو جاتے۔ لہذا کثرتِ روایت سے روکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا[۳]۔ حضرت عمرؓ جب کبھی عُمّال کو روانہ کرتے تو کچھ دور تک ساتھ جاتے تھے اور دیگر نصائح کے ساتھ یہ بھی ہدایت کرتے تھے کہ قرآن و سنّت کی تعلیم میں کوشاں رہنا اور حدیث کی روایت کم کرنا[۴]۔ ایک بار صحابہؓ کے ایک گروہ کو عراق بھیجا اور الوداع کے وقت کہا کہ تم ایسے علاقہ میں جا رہے ہو جہاں کے لوگ اس طرح قرآن خوانی میں مصروف رہتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناہٹ میں۔ انہیں حدیثوں میں نہ لگا لینا۔ حسنِ تلاوت، پہ دھیان دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرنا[۵]۔ حضرت عمرؓ کے ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز میں افراد سے بچنے کی ہدایت کی وہ روایت ہے سنّت نہیں۔

---

[۱] سیرت عمر از ابن جوزی صفحہ ۱۲۷ - سنن دارمی ؛ [۲] دارمی ؛ [۳] تذکرۃ ذھبی اور جامع بیان العلم میں علماء کی یہ رائے ملتی ہے کہ کثرتِ روایت حفظِ حدیث میں حارج ہوتی ہے ؛
[۴] طبری جلد ۵ ص ۱۹ ؛ [۵] ابن ماجہ ابواب السنۃ تذکرۃ الحفاظ - طبقات ابن سعد جلد ۶ ؛

یہ روایات اسی نوع کی ہیں جن کا ذکر حضرت ابو ہریرہؓ کے قول میں آیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں تو حضرت ابو ہریرہؓ اور بھی رُک کر روایت کرتے تھے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر بہت سختی کرتے تھے۔ بعد میں اتنی تحدید کی ضرورت نہ رہی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے ایام میں کیوں اتنی روایت نہیں کرتے تھے؟ جواب دیا کہ اس وقت ایسا کرتا تو ٹوٹ جاتا۔[۱]

حضرت عمرؓ کی سخت گیری سے یہ افسانہ چل نکلا کہ آپ نے تین صحابہؓ کو کثرتِ روایت کی بناء پر نظر بند کر دیا تھا[۲] حالانکہ یہ تینوں صحابیؓ خود ہی روایتِ حدیث میں متشدّد تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کی سختی کا بھی یہی حال تھا۔ آپ نے اس بارہ میں ایک خطبہ دیا تو ایک سامع کو یہاں تک غلطی لگی کہ روایت کر دیا کہ حضرت ابو بکرؓ نے اشاعتِ حدیث کی ممانعت کی ہے حالانکہ حضرت ابو بکرؓ کی شیفتگیِ سنّت کا جواب نہیں۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے چند روز قبل ایک لشکر کو شام کی طرف روانگی کا حکم دیا۔ کوچ کی نوبت نہ آئی تھی کہ حضورؐ نے سفرِ آخرت فرمایا۔ حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو اس لشکر کو روانگی کا حکم دیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبرِ وصال کے پھیلتے ہی عرب بھر میں بغاوت اور ارتداد کا ایک تلاطم ابھر آیا تھا جس کے تھپیڑے مدینہ کے کناروں سے ٹکرانے لگے تھے۔ صحابہؓ نے رائے دی کہ مصلحتِ وقت کو دیکھیں اور اس حکم کو ملتوی رکھیں۔ آپ نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ اگر یقین ہو جائے کہ مجھے درندے لے بھاگیں گے تو بھی یہ لشکر بھیج کر اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ کیا اس شان کا عاشقِ رسولؐ حدیثِ نبوی سے روک سکتا تھا؟

---

[۱] تذکرہ ذہبی۔ [۲] مستدرک حاکم (کتاب العلم) میں اس روایت میں غفلت بتائی گئی ہے۔ ابنِ حزم نے کتاب الاحکام (۲: ۱۳۹) میں اس کو جعلی کہا ہے۔ تذکرہ ذہبی میں ان صحابہ کے نام یہ ہیں: ابن مسعود ابو مسعود اور ابو درداد۔ مستدرک اور کتاب الاحکام میں بجائے ابو درداد کے ابو ذر کا نام ہے۔

صحابہ کرامؓ جنابِ رسالت مآب علیہ السلام کے مزاج شناس اور شریعت کے روح آشنا تھے۔ انہی حقیقت آگاہ نفوس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یوں خطاب کیا تھا: اگر تم میری کوئی حدیث سنو اور تمہارے باطن کو اس کی شناخت ہو، تمہارے ظاہر کو اس طرف میلان ہو اور تم اسے اپنے قریب دیکھو تو میں تم سے بڑھ کر اس حدیث کے قریب ہوں۔ اور اگر تمہارے باطن اس کی شناخت نہ کریں، تمہارے ظاہر اس سے نفور ہوں اور تم اسے اپنے سے دور دیکھو تو میں تم سے بڑھ کر اس سے دور ہوں [1]

صحابۂ کرام طبعًا اور عقلًا حدیث کے مسلّم الثبوت نقاد اور پایہ شناس تھے۔ انہیں جس حدیث میں ذرا بھی شبہ ہوتا اس کے بارہ میں تحقیق کرتے بلکہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ فقط ایک ایک حدیث اصل راوی سے تصدیق کرنے کو طویل سفر کئے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ قابلِ اعتماد صحابیؓ سے بھی گواہ طلب کر لیا یا قسم دلائی کہ واقعی یہ حدیث آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ گواہ یا قسم کا مطالبہ اس لئے نہ ہوتا کہ صحابی کی صداقت مشتبہ ہوتی تھی بلکہ اس لئے کہ بقول حضرت عائشہؓ سننے اور سمجھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے [2]

حدیث کی مندرجۂ ذیل انواع کے قبول کرنے میں خصوصی احتیاط برتی جاتی تھی اور خاص خاص افراد کے سوا راوی سے دوسرا گواہ طلب کیا جاتا تھا:

۱۔ وہ احادیث جو سُنَن نہ تھیں مثلاً صفاتِ الٰہی، ثواب و عقاب، مناقب اور پیشگوئیوں وغیرہ کے بارے میں تھیں۔

اوّل تو ان کی کثرت پر پابندی تھی۔ اور اگر کوئی بیان کرتا تو بہت احتیاط سے قبول کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے خوارج کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] جمع الفوائد باب روایت الحدیث .... الخ [illegible] حدیث کو دو صحابہ نے روایت کیا ہے۔ منتخب کنز العمال کتاب العلم میں [illegible] جلد اوّل ص ۱۶۰ میں اس موضوع پر کچھ بحث ہے [2] نیز دیکھو

ایک پیش گوئی بیان کی تو سننے والے نے تاکیداً پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حدیث رسول اللہ سے سنی ہے؟ حضرت علیؓ نے تین بار قسم کھا کر کہا کہ ہاں[1] اگرچہ حضرت علیؓ سے قسم نہیں لی گئی لیکن ان کا اصول تھا کہ راوی کو قسم دیتے تھے[2] اس لئے خود بھی تین بار قسم کھائی تاکہ سامع کو اطمینان ہو جائے۔

۲۔ وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بظاہر مناسبت نہ رکھتی ہوں۔

۳۔ وہ احادیث جو بظاہر قرآن کے خلاف نظر آتی ہوں۔

مطلقہ عورت کے نان و نفقہ کے بارہ میں حضرت عمرؓ کو ایک صحابیہ فاطمہؓ بنت قیس کی روایت سے حدیث پہنچی۔ آپ کو یہ حدیث قرآن حکیم کی ایک آیت کے خلاف نظر آئی۔ فرمایا، کہ ہم اللہ کی کتاب کو ایک عورت کے قول کے لئے نہیں چھوڑ سکتے۔ اللہ جانے اس نے حدیث صحیح یاد رکھی یا نہیں[3] جب بصرہ پر باغیوں کا قبضہ ہوا اور امت میں اختلاف اٹھا تو حضرت علیؓ نے مدینہ میں ایک خطبہ دیا جس میں سنت نبوی سے وابستہ رہنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ اشکال پیدا ہو تو قرآن کی روشنی میں اس کا معائنہ کرو، قرآن کے موافق ہو تو قبول کر لو ورنہ چھوڑ دو۔ (ابن اثیر)

۴۔ وہ احادیث جن کی بنا پر وراثت وغیرہ کی نوع کے حقوق کا فیصلہ ہوتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک متوفی کی جدّہ (یعنی دادی یا نانی) میراث کے لئے آئی۔ فرمایا، کتاب اللہ میں تمہارے حق کا ذکر نہیں اور نہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت مجھے معلوم ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا ہے کہ جدّہ کو چھٹا حصہ دیا جائے۔ پوچھا، کیا تمہارا کوئی شاہد ہے؟ محمدؓ بن مسلمہ نے اس روایت کی شہادت دی تو آپ نے جدّہ کو حصہ دیا[4]

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب التحریض علی قتل الخارج؛ [2] ترمذی ابواب تفسیر القرآن۔ تذکرۃ الحفاظ
[3] ترمذی؛ [4] تذکرۃ الحفاظ۔ ترمذی ابواب الفرائض۔ موطا امام مالک

۵۔ وہ حدیث جس کا علم سامع کے گمان میں اسے خود بھی ہونا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ حضرتِ محمودؓ بن ربیع صحابی نے ایک مجمع میں جہاں ابوایوب انصاریؓ بھی موجود تھے یہ حدیث بیان کی کہ جس آدمی نے رضائے الٰہی کی خاطر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے سن کر کہا، میں گمان نہیں کرتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا ہوگا۔ حضرتِ محمودؓ نے جاکر ایک اور صحابی سے اس کی تصدیق کرائی[۱]

حضرتِ ابوایوب انصاریؓ کو پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وسلم کا بہت قرب حاصل تھا۔ ہجرت کے بعد حضورؐ چھ ماہ ان کے مکان میں مقیم رہے تھے۔ اس لئے یہ حدیث انہوں نے آپؐ سے براہِ راست نہیں سنی تو ان کا شک بجا تھا۔ اس حدیث کا تعلق مُبادیِ ایمان سے ہے لیکن ہم سابقہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ ایسی احادیث کی عام اشاعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منظور نہ تھی، اس لئے حضرت ابوایوبؓ کو خبر نہ ہوئی۔

حضرتِ عمرؓ کے سامنے ایک دفعہ حضرتِ ابوموسیٰ اشعریؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ جب کوئی شخص کسی کے مکان پر جاکر تین بار اِذن طلب کرے اور جواب نہ پائے تو واپس چلا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا گواہ لاؤ ورنہ سختی سے پیش آؤں گا۔ ایک صحابی ابوسعید خُدری نے آکر گواہی دی۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے کہا کہ میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن یہ خدشہ ضرور ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں باتیں نہ جوڑیں[۲]

صحابۂ کرامؓ کی اس روش نے کہ حدیث کے قبول کرنے میں ایک معیار ہونا چاہیے علمائے مابعد کے زاویۂ نظر پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اصولِ درایت وضع کرنے میں ان کی رہنمائی کی ہے۔

صحابہؓ کا نظریہ کتابتِ حدیث کے بارہ میں

صحابۂ کرامؓ حفاظتِ حدیث میں بہت اہتمام کرتے تھے۔ اس کے باوجود حدیث کی کتابوں کی کثرت نہیں ہوئی

---

[۱] مسلم (۲: ۲۷) باب الرخصۃ فی التخلف من الجماعۃ بعذرٍ [۲] موطا امام مالک۔ ترمذی باب الآداب۔ مسلم باب الاستئذان بخاری کتاب التجارت۔

اور زیادہ انحصار حافظہ ہی پر رہا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ مثلاً

(۱) حدیث کی کتاب مرتب کرنا ایک عظیم ذمہ داری تھی۔ صحابہؓ کرام اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر لرزاں و ترساں رہتے تھے کہ ذمہ داری کے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بعض صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ حدیث روایت کرتے وقت لرز جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے حضرت عمرؓ نے جب یہ تجویز رکھی کہ قرآنِ حکیم کو ایک کتاب کی صورت میں تحریر کر لیا جائے تو پہلے پہل وہ جھجکے اور حضرت عمرؓ نے مشکل سے انہیں رضامند کیا۔ یہ کام حضرت زیدؓ کو سونپا گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اس کے بجائے اگر مجھے پہاڑ اٹھانے کا حکم ملتا تو اسے آسان تر سمجھتا۔

صحابہؓ کرامؓ چاہتے تھے کہ حدیث قلم بند کر لی جائے۔ لیکن دوسری طرف ذمہ داری کا احساس تھا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سُنن کے بارہ میں احادیث کی خاصی تعداد لکھی گئی تھی۔ یہ تحریریں محفوظ تھیں۔ اس لئے احساسِ ذمہ داری کی ہیبت کتابِ حدیث کے دھیان پر غالب رہی۔

حضرتِ ابوبکرؓ نے تقریباً پانچ سو احادیث لکھیں لیکن پھر یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اس میں کوئی غلط روایت نہ آ گئی ہو۔ ایک رات صبح تک اسی اضطراب میں رہے اور صبح ہوتے ہی یہ مجموعہ تلف کر دیا۔[۱]

(۲) یہ خدشہ تھا کہ حدیث کی کتاب لکھ کر عام کر دی گئی تو لوگ قرآن کو چھوڑ کر کہیں اسی کے نہ ہو جائیں۔

حضرتِ عمرؓ نے سُنن لکھنے کا ارادہ کیا۔ صحابہؓ کی رائے پوچھی۔ اُنہوں نے لکھنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عمرؓ ایک ماہ تک مزید غور کرتے رہے۔ آخر ایک صبح کہا کہ میرا ارادہ سُنن لکھنے کا تھا۔ لیکن پھر ایک قوم کا خیال آیا جنہوں نے ایک کتاب لکھی، پھر اُسی پر

---

[۱] تذکرۃ ذہبی ۔ ریاض النضرۃ ۱ - ۱۳۶ ۔ منتخب کنز العمال کتاب العلم

جھک گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا اللہ کی قسم میں کتاب اللہ میں ہرگز کوئی اور کتاب نہیں ملاؤں گا۔[1]

حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ کیوں تھا؟ اس کا پس منظر بھی دیکھ لیجیے۔ حضرت عمرؓ کو ایک دفعہ تورات کے کچھ جملے لکھے ہوئے مل گئے۔ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ حضورؐ نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے[2]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلیات کی زبانی روایت کی اجازت دی تھی۔ لیکن ان کے نوشتہ کو ناپسند فرمایا۔ صحابۂ کرام حضورؐ کے ایک ایک حرف کو دُرِ شاہوار کی طرح انمول جانتے تھے۔ اس واقعہ کا حضرت عمرؓ پر گہرا اثر تھا۔ اپنے عہدِ خلافت میں ایک شخص کو دیکھا جو حضرت دانیال کی کتابیں تلاش کرتا تھا۔ اسے خوب پیٹا[3]۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی اثر کے غلبہ سے آپ حدیث کی کتاب مدوّن کرنے سے محترز رہے۔

حضرت عمرؓ قرآن کی طرح ایک منضبط اور مدوّن کتاب لکھنے سے خائف تھے۔ ورنہ ویسے کتابت کے حق میں تھے۔ انہوں نے جستہ جستہ احادیث لکھی ہیں[4] اوروں کو بھی کہا کرتے تھے:

قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابَۃِ یعنی علم کو قیدِ تحریر میں لاؤ۔

جو صحابہؓ حدیث لکھنے کے مخالف تھے وہ حدیث ہی نہیں ہر نوع کے علم کو قلم بند کرنے سے روکتے تھے[5]۔

(۳) حفظ پر تاکید:- عہدِ صحابہؓ میں حفظ پر بہت تاکید تھی۔ کئی برس بعد تک یہ حال تھا کہ جس محدث کو حدیث زبانی یاد نہ ہوتی اور وہ کتاب سے روایت کرتا تو اس کو ضعیف سمجھتے تھے۔

علم درحقیقت وہی ہوتا ہے جو بجائے کتاب کے حافظہ میں ہو۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں عربوں کے حافظے بہت تیز تھے۔ اور وہ حفظ پر فخر کرتے تھے۔ کتابت

---

[1] جامع بیان العلم ص ۳۳۔ سیرت عمر ص ۱۲۹۔ [2] جمع الفوائد۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ باب ۷۲
[4] دارمی۔ مستدرک حاکم کتاب العلم میں اسے صحیح روایت بتایا گیا ہے [5] اس موضوع پر جامع بیان العلم اور دارمی باب من لم یر کتابۃ العلم میں روایات ملتی ہیں۔

پر بھروسہ کرنے سے قوتِ حافظہ کمزور ہو جاتی ہے اس لئے بعض صحابہؓ زبانی یادداشت کی ہدایت کرتے تھے۔

حافظہ کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی دوسرے شخص کی جعل سازی راہ نہیں پا سکتی۔ خلافت عثمانی کے اواخر میں بعض دشمنانِ دین نے پوشیدہ طور سے اسلام کو زک پہنچانا چاہی۔ انہوں نے جس منصوبہ بندی سے کام لیا اس کا ایک رُکن وضعِ حدیث بھی تھا۔ جعلی احادیث بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پھیلاتے تھے۔ صحابہؓ کرامؓ پر اس جادو کا چلانا ناممکن تھا۔ البتہ بعض اعداء جعلی تحریریں لکھ کر متوفی صحابہ کے نام منسوب کر دیتے تھے۔ اس مفسدہ سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ زیادہ انحصار یادداشت پر کیا جائے۔

(۴) بعض صحابی یہ کہہ کر تحریرِ حدیث سے روکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیث لکھنے سے منع فرمایا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم اس موضوع پر بحث کر آئے ہیں (دیکھو صفحہ ۵۵) معلوم ہوتا ہے کہ جن صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کسی خاص سبب کی بنا پر ممانعتِ حدیث کا حکم سنا اور پھر اجازت کا حکم حضورؐ سے براہِ راست سننے کا موقع نہ ملا وہ ایک مدت تک اس نہی پر کاربند رہے لیکن بالآخر سب صحابہ میں تحریرِ حدیث کے بارہ میں اتفاق رائے ہو گیا۔[1]

جو صحابی شروع میں حدیث لکھنے کے قائل نہ تھے ان میں ممتاز اصحاب یہ تھے: عبداللہؓ بن عباسؓ، عبداللہؓ بن مسعود، زیدؓ بن ثابت اور ابوسعید خدریؓ۔ ان میں سے ابوسعیدؓ خدری کے بارہ میں صفحہ ۵۵ پر بحث گزر چکی ہے۔ دیگر تینوں اصحاب سے ثابت ہے کہ انہوں نے حدیث پر کتابیں لکھیں۔ ان میں حضرتِ زیدؓ بن ثابت آخر تک ممانعت کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عینِ حیات

---

[1] فتح الباری جلد اوّل ص ۱۴۶

میں سر برآوردہ کاتبِ قرآن تھے۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا تھا[۱]۔ ممکن ہے اس ممانعت کا یہ سبب ہو کہ ان کے ہاتھوں سے قرآن و حدیث کی کہیں آمیزش نہ ہو جائے۔ حضرتِ زیدؓ خلافتِ راشدہ میں بھی قرآن کی کتابت پر مامور رہے۔ شاید اسی لئے کچھ عرصہ تک سختی سے اپنی رائے پر قائم رہے لیکن بعد میں انہوں نے بھی فرائض یعنی علمِ وراثت پر ایک مفصّل کتاب لکھی[۲]۔

حضرت انس بن مالکؓ جو ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خادم رہے ہیں اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ علم کو قیدِ تحریر میں لاؤ[۳]۔

حدیث عہدِ صحابہؓ کے مابعد کے ادوار میں

صحابۂ کرامؓ کا عہدِ سعادت مہد گزرا۔ تابعین اور تبعِ تابعین کی نوبت آئی۔ انہوں نے حدیث کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ علماء نے زندگیاں خدمتِ حدیث کے لئے وقف کر دیں۔ راحت و آرام کو خیر باد کہا۔ پیٹ پر پتھر باندھے، دُکھ جھیلے، مصائب اٹھائے۔ لیکن حدیث کی تحقیق و اشاعت میں کوتاہی نہ کی۔ لیل و نہار کا قافلہ اور آگے بڑھا۔ ہر دَور میں حق پرست علماء حدیث کی خدمت میں سرگرم رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے علانیہ اور دوست نما دشمنوں نے تبر سنبھالے۔ کئی فرقوں نے جنم لیا لیکن زمانہ کے ہاتھوں سے کچھ وہی بچ رہے جنہوں نے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ربط باقی رکھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ ربط بعد کی صدیوں میں کمزور پڑ گیا۔ طاؤس و رباب اوّل ہو گئے اور شمشیر و سناں آخر۔ امت نے اس کا جو خمیازہ بھگتا اس کی جھلک تاریخ کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے خونیں آنسوؤں میں صاف نظر آتی ہے۔ لیکن سنتِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ

---

[۱] جامع العلم ص ۳۲؛ [۲] سُننِ کُبریٰ بیہقی ج ۶ ص ۲۴۷ و ۲۴۸؛ [۳] مستدرک حاکم کتاب العلم

دارالسلام سے یہ نام کا ربط بھی اتنا کام کر گیا کہ امت کی اجتماعی حس میں کچھ رمق باقی رہ گئی۔ یہ نیم مردہ حس کسی وقت بھی بھڑک کر ایک شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے افتراقات سے بچنے کا واحد حل یہ بتایا ہے کہ سنت کا دامن پکڑے رہو۔ تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ سنت ہی اجتماع کا راز ہے۔

سنت کے معترف گروہوں میں کچھ برائے نام اختلافات ہیں لیکن یہ اختلافات اجتہادی ہیں۔ اصول اور کلیات میں کوئی تفریق نہیں۔ ضمنی اختلافات کے باوجود یہ مذاہب یک جان ہیں۔

جہاں رائے اور اجتہاد کا دخل ہو وہاں اختلاف کا وجود بھی ہوگا۔ لیکن اصول ایک ہوں تو جزئیات میں ٹکراؤ نہیں ہوتا اور یہ اختلافات رواداری اور وسیع القلبی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسی اختلاف کی طرف نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کر کے فرمایا ہے:

اِخْتَلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ (میزان شعرانی)

(میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے)

حدیث پر ایک عمومی نگاہ

اِس باب میں جو مباحث آچکے ہیں ان پر ایک بار پھر سرسری نگاہ ڈالو تو یہ نکات سامنے آئیں گے۔

(الف) انبیاءِ کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماقبل کے انبیاء کی نبوت کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اصولی اور عمومی لحاظ سے قرآن حکیم سابقہ انبیاء کی پیروی بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نبیِّ آخر الزمان ہیں۔ اس لئے آپ کی اطاعت تاقیامت واجب ہے۔

(ب) قرآن حکیم کا بیان اور وضاحت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی میں دستیاب ہے۔ سنت نہ ہو تو نماز و روزہ اور حج کی کیفیت معلوم نہ ہو سکے اور قرآن حکیم کی کتنی ہی آیات ہمارے لئے لغتِ غریب ہو کر رہ جائیں مثلاً سورۃ الفیل اور سورۃ اللّھب ہی کو لو، حدیث نہ ہو تو کیوں کر معلوم ہو کہ اصحابِ فیل کون تھے اور مکہ پر حملہ کا کیا واقعہ تھا؟ ابو لہب کون تھا اور قرآن میں اِس کا ذکر کیوں آیا ہے؟ یہی حال سورۃِ انفال، سورۃِ احزاب اور دیگر سورتوں کا ہے۔

(ج) سنتِ نبوی اسلامی فقہ کا ایک بنیادی ماخذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بے مثال بصیرت دی تھی۔ آپؐ نے جو فقہی احکام صادر فرمائے ہیں وہ ہماری کامیاب زندگی کی ضمانت ہیں۔ اسلامی فقہ کی ترتیب سنتِ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بغیر محال ہے۔

(د) سنت اجتماع کی روح پیدا کرتی ہے۔ سنت نہ ہو تو اُمت ایسی پارہ

پارہ ہو جائے کہ اس کی شیرازہ بندی محال ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد جلد ہی اختلافِ کثیر دیکھو گے۔ پس میری سنت اور میرے راست رُو خلفاء کی سنت کو تھام رکھنا۔

(د) تاریخ ثابت کرتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے سر سے سینکڑوں جھگڑ گزر گئے۔ ان ابتلاؤں سے اگر کوئی گروہ کچھ سالم نکلا ہے تو ان کا جنہوں نے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ نہ ٹوٹنے دیا۔

(س) ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے قطعی اور بیّن طور سے ثابت ہے کہ حدیث کی اشاعت کی جائے۔ حضورؐ کی زندگی میں مسجدُ النبی میں حدیث و فقہ کی تدریس ہوتی تھی۔ بعض صحابہؓ نے آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے بہ راہِ راست احادیث سن کر لکھ لی تھیں۔

(ص) صحابۂ کرامؓ حدیث کی تبلیغ پر بہت تاکید کرتے تھے۔ صحابۂ کبار نو مفتوح ممالک میں دین کی تعلیم کے لئے بھیں گئے۔ قرآن کے ساتھ حدیث کی تدریس بھی ہوتی تھی۔

الغرض یہ مختصر دلائل ہیں جو گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہیں۔

حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت ایک اور ضرورت سے بھی ابھرتی ہے۔ قرآنِ حکیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے امّت تک پہنچا۔ اسی ذاتِ پاک کی دعوت پر اسلام کی صداقت مسلّم ہوئی۔ اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ ہم حضورؐ پر ایمان کیوں لائے اور حضورؐ کے توسط سے قرآن و اسلام کے آگے ہماری گردنیں کیوں جھک گئیں تو ہمارا صاف اور سادہ جواب یہ ہوگا کہ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی قولی اور عملی صداقت ہمارے سامنے روشن ہے۔ اس صداقت کے کسی ایک ادنیٰ جزئیہ کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایسی صادق القول اور صادق العمل

ہستی کی دعوت سے کوئی کس طرح انکار کر سکتا ہے؟ ہمارا یہ دعویٰ جبھی کامیاب ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہمارے سامنے ہو اور آپؐ کی زندگی کے اوراق ہمارے سامنے کشادہ ہوں۔ حدیثِ رسولؐ ہمارے لئے مدارِ ایمان ہے۔ اس لئے اس کی تحقیق و جستجو میں علمائے کرام نے زندگیاں وقف کر دیں اور بڑے بڑے مصائب اٹھائے اور جیسا کہ مقامِ حدیث کا تقاضا تھا اسے عام تاریخ کی سطح سے ماوراء رکھا کیونکہ تاریخ سے زیادہ سے زیادہ عقیدت ہو سکتی ہے ایمان وابستہ نہیں ہوتا۔

حدیث کا جو سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بے شک ضعیف اور ناقابلِ اعتبار روایات بھی داخل ہو گئی ہیں لیکن علمائے کرام نے صحیح و غلط میں تفریق کر دی ہے۔ حدیث کی کوئی مستند کتاب مثلاً صحیح مسلم یا صحیحِ بخاری اٹھا کر دیکھو۔ اس کا بیشتر حصہ ایمانیات، عبادات اور بنیادی قوانین کے بارہ میں ہے۔ یہ متواتر ہیں۔ احکام کی دیگر احادیث جن پر مسائلِ فقہ کی بنیاد ہے تقریباً سب شہرت کے درجہ میں ہیں[1] مناقب اور تفسیر وغیرہ کے بارہ میں جو احادیث ہیں ان کا حصہ قلیل ہے لیکن اس نوع کی جو احادیث مستند مجموعوں میں ہیں ان پر حرف رکھنا آسان نہیں۔

حدیث کی صحت پر ایک سطحی اعتراض بعض احادیث کے ظاہری تعارض سے ہو سکتا ہے۔ لیکن حدیث کا وسیع مطالعہ کیا جائے جیسا کہ اس فن کا حق ہے تو تعارض اُٹھ جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ لکھتے ہیں کہ اختلاف حقیقۃً نہیں ہوتا ہماری نظر میں ہوتا ہے[2] احادیثِ صفات میں کہیں تعارض نہیں۔ احادیثِ معجزات میں بھی تعارض نہیں۔ احوالِ جنّت و جہنم کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں تعارض نہیں۔ والنادر کالمعدوم۔ البتہ ان احادیث احکام میں بعض احادیث متعارض ہیں اور وہ بھی اس قدر قلیل ہیں کہ ان کو غیر متعارض

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب ۸۰؛ [2] حجۃ اللہ البالغہ باب ۸۱؛

احادیث سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک کو ہزار سے ہے[1]

---

[1] مولانا محمد ادریس کاندھلوی ؒ

بابِ سوم

تدوینِ حدیث

دَورِ اوّل

عہدِ نبُوّت

کتابتِ حدیث سابقہ باب میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریرِ حدیث کی اجازت اور ترغیب دی تھی۔ آپؐ کے عہدِ مبارک میں حدیث کا ایک اہم ذخیرہ قیدِ تحریر میں آ گیا۔ اس کا ایک حصّہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود لکھوایا اور کچھ صحابہ کرام رضؓ نے اپنے طور سے لکھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظامی فرامین، مکتوبات اور معاہدات بھی ذخیرۂ حدیث کا اہم جزو ہیں۔ ہم انہیں تدوینِ حدیث کی ارادی کوشش شمار نہ کریں تو بھی ان کی افادیت کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان میں اسلام کے بعض بنیادی اصول ہیں۔ مثلاً میثاقِ مدینہ ہی کو دیکھو تو یہ عدیم النظیر دستور جو تقریباً پچاس دفعات پر مشتمل تھا مسلمانوں کے لئے بَین المِلّی روابط میں گراں قدر رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

ان دستاویزوں کو سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر لیا گیا۔ اس سے غرض محض تاریخ پرستی نہ تھی بلکہ مدعا یہ تھا کہ یہ مُہتمّ بالشان ترکہ دستور العمل کے طور پر صحیح و سالم رہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے حال ہی میں عہدِ نبوی کی تقریباً اڑھائی سو دستاویزات کا مجموعہ مصر میں طبع کرایا ہے۔

ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنَن یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور دیگر احکام

پر تحریرات لکھوائیں۔ روایات کا غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں نہایت جامع تھیں۔ ان کی ایک فہرست درج ذیل ہے[۱]

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے دوسرے برس خون بہا کی شرحیں ایک کاغذ پر لکھوا کر تلوار کی نیام میں رکھ لی تھیں[۲] اس نوشتہ سے مسلسل یا اس کے ماسوا ایک اور تحریر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نیام میں محفوظ تھی جس میں مندرج تھا کہ جس نے اندھے کو غلط راستہ پر چلایا، قطعاتِ زمین کی علامات چرائیں، غیر موالی سے موالات کی یا جس نے بھلائی کی ناشکری کی اس پر اللہ کی لعنت ہے[۳]

۲۔ کتابِ سعدؓ بن عبادہ :۔ آپ کے پاس احادیث کی ایک کتاب تھی جس سے آپ کے بیٹے نے روایت کی ہے[۴]

۳۔ ہجرت کے آٹھویں برس فتحِ مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ ایک شخص ابو شاہؓ نے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھوا دیجیے۔ حضورؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ ابو شاہ کو خطبہ لکھ دو۔[۵]

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ اور دیگر احکام پر نوشتے لکھوا کر جاری فرمائے[۶]۔ ایک نوشتہ آپؐ نے اپنے پاس رکھ لیا تھا جسے کتابُ الصَّدَقہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس تھا۔ اس پر دیگر خلفاء کا بھی عمل رہا۔ حضرت عمرؒ ثانی نے اس کی نقل حاصل کی۔ ہشام نے اس کی

---

[۱] راقم سطور کی رائے میں یہ ایک نامکمل فہرست ہے۔ اگر کتبِ حدیث و تاریخ کی مزید جستجو کی جائے تو اس میں اضافہ ممکن ہے [۲] طبری ابن اثیر واقعات ۲ ھ [۳] کتاب جامع العلم مسند احمد احادیث جابر بن عبد اللہؓ [۴] ترمذی کتاب الاحکام۔ مسند احمد احادیث سعد بن عبادہ ۵ : ۲۸۵ [۵] مسلم کتاب الحج۔ بخاری کتاب العلم۔ ترمذی کتاب العلم و الدیات۔ مسند احمد حدیث نمبر ۷۲۴۱ [۶] جامع العلم

نقول عُمّال کو بھیجیں [1]

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک نقل فاروقِ اعظم رضؓ نے خود بھی کی تھی [2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب الصدقہ سے مفصل تر کتاب عمرو بن حزم کو اہلِ یمن کے لئے دی گئی تھی۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جس میں فقہی مسائل کے کثیر موضوع تھے مثلاً زکوٰۃ، دیات، گناہِ کبیرہ، طلاق، عتاق، صلوٰۃ، مسِّ مصحف وغیرہ [3]

اِس کتاب پر سب فقہاء نے عمل کیا ہے [4] اِس کو تواتر کا درجہ حاصل تھا۔ صحابہ رضؓ و تابعین اس کی طرف رجوع کرتے تھے [5]

اِس نوعیت کے دیگر نوشتوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک نسخہ بنو زُہیر کے نام تھا [6] ایک حضرت انس بن مالک رضؓ کو دیا گیا جس کی کتابت حضرت ابوبکر رضؓ نے کی تھی [7] ایک حضرت طاؤس کے پاس تھا [8] ایک نوشتہ حضرت مُعاذ بن جبل رضؓ کے پاس تھا [9]

۵۔ صحیفۂ علی رضؓ [10] یہ صحیفہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے حضرتِ علی رضؓ کو لکھوایا تھا۔ اس کے حجم کا اندازہ لگانا اس وقت مشکل ہے۔ مختصراً اس میں یہ احکام تھے:

قصاص و دیات، حرمتِ مدینہ، حرمتِ مومنین، دشمن کے ہاتھ سے اپنے اسیر کی رہائی، یہ ارشاد کہ ذمۂ مسلمین واحد ہے، جس شخص نے باپ کو چھوڑا یا اپنے موالی کو چھوڑ کر دیگر سے موالات کی، یا اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا، زمین کی علامات چرائیں، یا باپ پر لعنت کی اس پر اللہ کی لعنت ہے [11]

---

[1] مستدرک حاکم۔ ابوداؤد۔ دارمی کتاب الزکاۃ۔ کتاب الخراج ابو یوسف ص ۷۶۔ زاد المعاد [2] مسند شافعی۔ موطا [3] زاد المعاد۔ دارمی۔ موطا کتاب العقول۔ مُسند شافعی۔ سیرت عمر از ابن جوزی ص ۱۲۵ [4] زاد المعاد [5] فتح العلام ص ۳۶ [6] زاد المعاد [7] زاد المعاد۔ سنن ابوداؤد۔ مستدرک حاکم کتاب الزکاۃ۔ مسند شافعی [8] مسند شافعی [9] مستدرک حاکم [10] جمع الفوائد ۱: ۱۵ [11] کتاب الحج باب فضل المدینہ۔ بخاری باب فضل المدینہ و باب الجہاد۔ ترمذی ابواب الولاد کتاب الدیات جامع العلم ص ۳۶

(۶) اَلصَّحِیفَۃُ الصَّادِقَۃ[۱] یہ حضرتِ عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص کی کتاب تھی جسے انہوں نے جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں لکھا تھا۔ ابنِ عمروؓ اسے ایک صندوق میں بند رکھتے تھے[۲] اور کہا کرتے تھے کہ مجھے اس کتاب کی وجہ سے زندگی عزیز ہے[۳] یہ ایک ضخیم مجموعہ تھا۔

حضرتِ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں صرف حضرت ابن عمروؓ کو یاد تھیں کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا[۴]

حضرت ابوہریرہؓ سے حدیث کی ایک کثیر مقدار مروی ہے۔ آپ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صادقہ میں احادیث اس سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ نسخہ حضرت ابن عمروؓ کے پوتے عمروؓ بن شعیب کے پاس تھا۔ وہ اس سے روایت کیا کرتے تھے[۵]

اس صحیفہ کے مضامین کے بارہ میں اتنا قطعیت سے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے بارہ میں احکام تھے۔ علاوہ بریں دعائیں اور پیشگوئیاں بھی تھیں[۶]

(۷) حضرت سمرہؓ بن جندب نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں کثیر احادیث تھیں[۷]

(۸) کتابِ جابرؓ بن عبد اللہ:۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ صحابی کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا[۸] سرِ دست ہمارے سامنے کوئی حتمی ثبوت نہیں کہ یہ نوشتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حینِ حیات میں لکھا گیا یا بعد میں۔

---

[۱] ابن سعد ۴: ۲ ص ۸، ۹ [۲] مسند احمد حدیث نمبر ۶۶۴۵ [۳] دارمی جامع بیان العلم

[۴] تذکرہ ذہبی۔ بخاری کتاب العلم۔ ترمذی کتاب العلم [۵] تہذیب التہذیب۔

[۶] ترمذی کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ و کتاب الدعوات [۷] تہذیب التہذیب۔

[۸] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۱۵ ترمذی ابواب البیوع۔ مسند احمد ۳-۳۳۴

(۹) حضرتِ انسؓ بن مالک کے پاس ایک مجموعۂ حدیث تھا۔[1] یہ مجموعہ انہوں نے رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنایا تھا۔[2]

(۱۰) کتابِ اسماء بنتِ عُمَیسؓ[3]:۔ اس کتاب کے بارے میں بھی حتماً نہیں کہا جا سکتا کہ عہدِ نبوی میں لکھی گئی یا دَورِ صحابہؓ میں۔

یہ تحریریں مفصل تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی یا آپؐ کی حیاتِ مبارک میں آپؐ سے سن کر لکھی ہوئی کچھ مختصر تحریریں بھی صحابہؓ کے پاس تھیں۔ ان میں حضرتِ وائلؓ بن حجرؓ[4] رافعؓ بن خدیجؓ[5] مالکؓ بن احمرؓ[6] اور ضحاکؓ بن قیس[7] کی تحریریں قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] ابن سعد [2] تدوین حدیث از مناظر احسن گیلانی بحوالۂ مستدرک حاکم [3] تشریحُ الاسلامی از سلیمان مصری [4] معجم صغیر طبرانی [5] مسلم کتاب الحج فضل المدینہ۔ مسند احمد [6] جمع الفوائد کتاب الایمان [7] موطا کتاب العقول؛

دُوسرا دَور

وصالِ نبویؐ سے پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک

(یہ دَور صحابۂ کرامؓ اور تابعینِ کبارؒ کا ہے)

تحصیلِ حدیث

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا واحد نصب العین یہ تھا کہ سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم چلیں۔ ہر صحابی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام واقعات کا علم نہیں تھا اس لئے صحابۂ کرامؓ ایک دوسرے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کرتے تھے۔ بارہا ایک ایک حدیث کی طلب میں انہوں نے جوکھوں اٹھائے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ ایک حدیث کی تحقیق کے لئے مدینہ سے چل کر اس حدیث کے راوی عُقبہ بن عامرؓ کے پاس مصر پہنچے۔ اور ان کی زبانی حدیث سن کر تشفی کی۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے کسی شخص سے ایک حدیث عبداللہ بن انیس انصاریؓ کے حوالہ سے سنی۔ تسلی نہ ہوئی۔ اونٹ خریدا اور اس پر بیٹھ کر شام میں عبداللہ بن انیسؓ کے پاس پہنچے اور ان سے حدیث سن کر مطمئن ہوئے[1]

کتابتِ حدیث

صحابۂ کرامؓ حدیث کو نہ صرف حفظاً جمع کرنے میں کوشاں رہے بلکہ تحریراً بھی اس کی حفاظت کا اہتمام کیا۔ ان کے سامنے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کی تحریریں موجود تھیں۔ انہوں نے اس ذخیرہ میں مزید اضافہ کیا۔ مندرجہ ذیل صحابہؓ کی یادداشتیں اس سلسلہ میں معرضِ تحریر میں آئیں:

---

[1] جامع بیان العلم ص۹۳ فتح الباری باب کتابت العلم

(۱) حضرت ابوہریرہؓ:۔ آپ نے اپنی روایات قلم بند کروا کر رکھ لی تھیں۔ یہ کئی نوشتوں پر مشتمل تھیں۔[۱]

حضرت سعیدؓ بن جُبیر نے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثیں لکھیں اور رخصت ہونے سے پہلے سنا کر توثیق حاصل کر لی۔[۲] بَشیر بن نُہَیک نے بھی ان حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھا اور انہیں روایت کرنے کی اجازت لی۔[۳]

حضرت ابوہریرہؓ نے ۱۳۸ حدیثوں کا ایک صحیفہ اپنے شاگرد ہمّام بن مُنَبِّہؒ کو لکھوایا اس کا نام اَلصَّحِیفَۃُ الصَّحِیحَہ ہے اور صحیفۂ ہمّام بن مُنَبِّہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ صحیفہ صحیح و سالم موجود ہے اور چھپ گیا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ:۔ شروع میں آپ حدیث لکھنے کے خلاف تھے۔ بعد ؛ حق میں ہو گئے۔[۴]

ابن عباسؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آزاد کردہ غلام ابورافع اسلمؓ کی مرویات لکھی تھیں۔[۵]

آپ کا ایک صحیفہ طائف میں تھا۔ وہاں کے چند آدمی اسے آپ کے پاس لائے اور آپ کے سامنے پڑھا۔[۶]

نَجدہ حَروری کو آپ نے ایک طویل خط لکھا تھا جس میں عورتوں کے شمولِ جہاد اور ان کے حصۂ غنیمت، مدتِ یتیمی، خُمُس، ذَوُ القُربیٰ، اور بچوں کو قتل نہ کرنے کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت درج کی تھی۔[۷]

حضرت ابن عباسؓ کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

---

[۱] فتح الباری باب کتابۃ العلم [۲] جامع بیان العلم ۷۲/۱ [۳] بیان العلم ۷۲/۱، دارمی ۶۸ [۴] ترمذی کتاب العلل [۵] دارمی [۶] ابن سعد [۷] ترمذی [۸] مسلم کتاب الجہاد و السیر۔

(۳) حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ :۔ آپ نے احادیث کا ایک مجموعہ لکھا تھا[۱]

(۴) حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ :۔ آپ کا قول ہے قَیِّدُوا هٰذَا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ (اس علم کو تحریر میں لاؤ) ۔ آپ کی روایات حضرت سعید بن جبیر نے لکھیں[۲]

(۵) حضرت زیدؓ بن ثابت :۔ آپ نے حضرت معاویہؓ کو وراثت پر ایک طویل تحریر لکھی تھی ۔ یہ اس قدر کافی و وافی تھی کہ اس کے ہوتے امام شافعی کے نزدیک اس موضوع پر دیگر کتاب کی حاجت نہ تھی[۳]

(۶) حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھا تھا ۔ آپ دین میں بہت محتاط تھے ۔ اس خیال سے اسے چاک کر دیا کہ کہیں غلطی نہ ہو گئی ہو[۴] آپ نے زکوٰۃ کے بارہ میں ایک نسخہ لکھا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کتابتِ حدیث کو مانتے تھے[۵]

مندرجۂ بالا تحریریں خاصے بڑے مجموعے تھے ۔ ان کے علاوہ بعض صحابہؓ نے جستہ جستہ احادیث بھی لکھیں ۔ حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ کے احکام غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابُ الصدقہ سے نقل کر کے لکھے (مستدرک حاکم کتاب الزکاۃ) حضرتِ عمرؓ نے آذربائیجان والوں کو ریشمی لباس سے ممانعت کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث لکھی[۶] حضرت عائشہؓ نے حضرتِ معاویہؓ کی خواہش پر انہیں ایک حدیث لکھ کر بھیجی[۷] حضرتِ مغیرہؓ بن شعبہ نے حضرتِ معاویہؓ کو ان کی درخواست پر کثرتِ سوال، قیل و قال اور فضول خرچی سے دور رہنے کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور بعدِ نماز کی ایک دعا لکھی[۸] ۔ حضرت جابرؓ بن سمرہؓ نے حضرت سعدؓ وقاص کو ان کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] جامع بیان العلم [۲] جامع بیان العلم ۔ دارمی [۳] سنن بیہقی ۶ - ۲۴۸ - جوہر النقی ابن ترکمانی ۔
[۴] ریاض النضرۃ [۵] فتح العلام کتاب الزکاۃ ص ۲۶۲ ۔ [۶] مسلم کتاب اللباس والزینۃ ۔ [۷] ترمذی باب صفۃ القیامۃ [۸] مسلم کتاب الصلوٰۃ ج ۲ ص ۹۵ و ۹۶ جلد ۵ ص ۱۳۱ ۔

کے خطبہ کے کچھ فقرات لکھے[1] حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ صحابی نے ایک صاحب کو خط میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لکھی[2]

مذکورۂ سابقہ کتب حدیث نے پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک اپنا تسلط قائم رکھا۔ اس دور میں حدیث کی روایت یا زبانی ہوتی تھی یا ان کتابوں سے۔ یہ کتابیں ان کے جامعین کے اپنے گھرانوں یا شاگردوں کے گھرانوں میں وراثۃً باقی رہیں۔ حضرت عمرؓ کے پاس جو کتاب الصدقہ تھی وہ کافی عرصہ ان کے خاندان میں رہی۔ الصّحیفۃ الصّادقہ کی روایت حضرت عمروؓ بن العاص کے بیٹے اور پوتے نے کی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا الصحیفۃ الصحیحہ ان کے شاگرد ہمّام بن مُنبّہ کا مدارِ روایت رہا۔ ان کی دیگر کتابیں حضرت عمر ثانی کے والد عبدالعزیز کے پاس تھیں۔ جابرؓ بن عبداللہ کی کتاب سلیمان یشکری اور قتادہ وغیرہ کے زیرِ نگاہ رہی۔ ابنِ مسعودؓ کی کتاب ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کے پاس تھی۔

ان کتابوں کے علاوہ حضرت عُروہ بن زبیرؓ نے جو حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے اور جنہوں نے ان سے احادیث کی ایک کثیر تعداد روایت کی ہے ضخیم تحریریں لکھی تھیں۔ پھر جلا دیں۔ بعد میں حسرت سے کہا کرتے تھے کہ کاش میری کتابیں باقی ہوتیں، (اب تو قرآن مستحکم ہو چکا ہے[3] لہٰذا دیگر کتابوں کا حرج نہیں)

مغازی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگوں کے حالات کا شوق روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔ پہلی صدی کے اواخر میں مغازی پر ابتدائی تالیفات ہوئیں۔

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب الناس تبع لقریش [2] مسلم کتاب الجہاد [3] تہذیب التہذیب

تیسرا دَور

۱۰۰ ہجری سے ۱۵۰ ہجری تک

فنِ حدیث کی ابتداء عہدِ نبوت سے بُعد جس قدر بڑھ رہا تھا حدیث کا جمع و حفظ مشقت طلب ہو رہا تھا۔ اسلامی مملکت کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں اور علمائے حدیث اطراف میں منتشر ہو گئے۔ طالبانِ حدیث کو بعض دفعہ بہت دشوار اور ہمت آزما منزلیں مارنی پڑتی تھیں۔ یہ جسمانی مشقت تھی۔ ذہنی مشقت اس سے فزوں تر تھی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے سَنَد کی کڑیاں بڑھ رہی تھیں۔ راویوں سے غلطی اور غفلت کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور آفت وضعِ حدیث کی پیدا ہو گئی تھی۔ اسلام میں گروہ بندی نے سر اٹھایا۔ بعض لوگ اپنے عقائد کی تائید میں حدیثیں گھڑ دیتے تھے۔ نِفاق پیشہ دشمنانِ اسلام کی بھی کمی نہ تھی۔ اسلام میں رخنہ ڈالنے کے لئے وہ بھی اپنے مطلب کی حدیثیں تخلیق کر لیتے تھے۔ اس لئے اب لازم ٹھہرا کہ اِسناد کی خوب پوچھ گچھ ہو۔ اتصال و انقطاع کے سراغ نکالے گئے۔ خبرِ واحد اور خبرِ متواتر کا فرق قائم ہوا اور جَرح و تعدیل کے فن کی بنا پڑی۔ اس دَور میں امامِ اعظمؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ ایسے بالغ نظر فقہا پیدا ہوئے جنہوں نے حدیث کے کڑے معیار قائم کئے۔ جعلی روایات کا ان معیاروں کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ آئندہ دَور کے تذکرہ میں ہم بتائیں گے کہ ان کی بیخ کنی کیسے ہوئی۔

حافظہ کا اعتماد کتابتِ حدیث کا رواج رُو بہ ترقی تھا۔ تاہم اصل اعتماد ذہنی یادداشت ہی پر تھا۔ جو شخص فقط تحریر سے روایت کرتا اس کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ تحریروں میں بالخصوص وہ نسخے جو متوارث چلے آئے تھے ان میں یہ اندیشہ

ہو سکتا تھا کہ کسی جعل ساز نے تصرف کر دیا ہو۔ اس لیے ان کے بارہ میں خصوصی احتیاط برتی جاتی تھی۔ راوی کے براہِ راست سماع کے بغیر کتابی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ اگر کمزور حافظہ والا شخص ویسے قابلِ اعتماد بھی ہو اور حدیث سن کر تحریر بھی کر لی ہو تو بھی اس کا بھروسا مت کرو۔[1]

تحصیلِ علم | حدیث کا علم اب ایک فن کے سانچہ میں ڈھل رہا تھا اور اس میں مہارت کا حصول روز بروز مشکل ہو رہا تھا۔ اس لئے علمائے حدیث نے تدریس کو وسعت دی۔ شہر شہر میں درس کے حلقے قائم ہوئے۔ بعض حلقوں میں شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی اور معلّم کے لئے مشکل ہو جاتا تھا کہ اپنی آواز سامعین تک پہنچائے۔ اس لئے ایسے اشخاص کو مقرر کر دیتے تھے جو معلم کے الفاظ بلند آواز سے دہرا کر آگے پہنچا دے۔ ایسے شخص کو مُستملی کہتے تھے۔

احادیث کی شہری تقسیم | جب تک زندگی کے مسائل ایک بے پناہ ہجوم کی صورت میں ریلا کر کے نہیں آئے ہر شہر کے لوگ انہی احادیث پر تکیہ کئے بیٹھے رہے جو ان کے شہر میں شائع تھیں۔ دیگر شہروں کی احادیث پر دروازہ بند کرنا ممکن نہ تھا لیکن ایک حد تک روایات کی علاقہ وار تقسیم ہو گئی مثلاً حجازی، بصری، کوفی اور شامی حدیثیں۔ ہر شہر اپنے علمی قائد سے وابستہ رہتا تھا اور اسی کی روایات پر زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ حدیثوں کی علاقائی تقسیم اور علماء کی شخصی قیادتوں پر اجماع نہیں تھا۔ لیکن ماحول کے وقتی تقاضوں نے عارضی طور سے مذکورہ تقسیم پیدا کر دی تھی۔

کتابتِ حدیث | زیرِ نظر دور میں حدیث کے متعدد نسخے لکھے گئے اور کتابتِ حدیث کی رو چل نکلی۔ اس کے محرک حضرت عمر بن عبد العزیزؒ تھے۔ آپ ۹۹ ہجری میں خلیفہ ہوئے۔ آپ نے علماء کو لکھا کہ حدیث تحریر کر لی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ علماء آہستہ آہستہ سفرِ آخرت کر جائیں اور یہ علم کھو جائے۔ اس حکم کے تقریباً اڑھائی برس بعد ۱۰۱ ہجری میں آپ عازمِ خلد

[1] زروادی ص ۳۹

ہو گئے۔ لیکن آپ نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا وہ برگ و بار لاکر رہی۔

آپ کے حکم کی تعمیل میں مدینہ کے قاضی ابو بکر بن محمد نے ایک مجموعہ تیار کیا۔ نیز امام زہری مدینہ کی گلی گلی میں گئے اور ایک ایک دروازے پر دستک دے کر حدیث پوچھی۔ آپ نے مرفوع اور موقوف سب قسم کی احادیث جمع کیں اور کتابوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔

یہ تحریک مدینہ کے شہر سے چلی اور وہیں اس نے ابتدائی مرحلے بھی طے کئے۔ مدینہ کے علمائے حدیث کتابیں لکھ کر ان سے درس دیتے تھے۔ وہاں کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن جس کو خلعتِ دوام نصیب ہوا وہ موطا ہے۔

مُوَطّا۔ یہ تالیف حضرتِ امام مالک بن انس کی ہے۔ آپ ۹۳ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ ہجری میں اسی شہر مقدس میں ابدی آرام گاہ آباد کی۔ آپ کا گھرانا علم حدیث میں مشہور و معروف تھا۔ آپ انتہا کے ذہین اور قوی الحافظہ تھے۔ جو بات ایک دفعہ سنتے ذہن سے اترتی نہ تھی۔ شباب کا آغاز ہی تھا کہ مدینہ میں تدریس کرنے لگے اور مُوَطّا لکھ کر اسے مدارِ درس بنایا۔ اس وقت اس کتاب میں تقریباً دس ہزار حدیثیں تھیں۔ آپ اس کتاب کی ساتھ ساتھ ترمیم کرتے رہے۔ لہٰذا یہ بتدریج مختصر ہوتی اور اس کی احادیث کم ہوتی گئیں۔ آخری برسوں میں کل ۱۷۲۰ رہ گئیں۔ ان میں بھی مرفوع حدیثیں کل ۸۲۲ ہیں۔ تدریجی ترمیم کی وجہ سے مُوَطّا کے کئی مختلف نسخے رائج ہو گئے۔

مُوَطّا حدیث کے ساتھ فقہ کی بھی کتاب ہے۔ یہ فقہی ابواب میں منقسم ہے۔ اس میں صرف فقہی احادیث ہیں یعنی جن کی غرض احکام سے ہے۔ تفسیر، مناقب اور زہد وغیرہ کے ابواب نہیں۔

مُوَطّا صحت کے انتہائی درجہ پر ہے۔ اس کی صحت پر علمائے اسلام متفق ہیں۔

مُوَطّا کے مُروّج نسخے اس وقت دو ہیں۔ ایک کے راوی مشہور حنفی امام محمد ہیں۔ ان کا نسخہ موطائے محمد کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا نسخہ جو بالعموم موطائے مالک

کہلاتا ہے امام مالک کے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اندلسی کا روایت کردہ ہے۔

مؤطا شہرِ مدینہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے دوش بہ دوش شہری نوعیت کی اور بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ کسی پر فقہ کا رنگ غالب تھا کسی پر تفسیر وغیرہ کا۔ ان میں سے بعض کے مؤلفین کی ایک فہرست حسبِ ذیل ہے:

(۱) ابنِ جُریج:(متوفی ۱۵۰ھ) آپ مکہ میں مقیم تھے۔ آپ کی کتاب تفسیر میں تھی۔

(۲) امام اوزاعی:(متوفی ۱۵۶ھ) آپ شام میں تھے۔ فقہ کے امام تھے۔

(۳) سُفیان ثوری:۔(متوفی ۱۶۱ھ) آپ کوفہ میں تھے۔ آپ کی کتاب جامع سفیان ثوری فقہ میں تھی۔

(۴) ابو سلمہ حمّاد بن دینار:۔(متوفی ۱۶۷ھ) آپ کی سکونت بصرہ میں تھی۔

(۵) مَعمر بن راشد:۔(متوفی ۱۵۳ھ) آپ یمن میں مقیم تھے۔

(۶) عبد اللہ بن مبارک:۔(متوفی ۱۸۱ھ) آپ عالمِ خراساں تھے۔ آپ کی کتاب زُہد میں تھی۔

اس دور میں سیرت کے فن کو دو غیر فانی شہرت کے خادم ملے۔ ایک موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) ہیں اور دوسرے محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۰ھ)۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب ناپید ہے۔ محمد بن اسحاق کی کتاب ایک عرصہ معدوم رہی۔ ابنِ ہشام نے اس کی مرویات کو اپنی کتاب میں لے لیا ہے۔

حدیث کی مقامیت اس دور میں مٹنی شروع ہوئی۔ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مذاہب کی بنا عالم گیر زاویۂ نگاہ سے رکھی تھی اس لئے تمام اسلامی دیار کی احادیث جمع کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ان کے رفیقِ طریق امام احمد بن حنبلؒ (پیدائش ۱۶۴ھ) اور بعض دیگر علماء نے ایک ایک حدیث یکجا کرنے کی ٹھان لی چاہے مملکت کے کسی کونہ میں ہو۔ یہ اصحاب علم تدوینِ حدیث کے نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کے بانی ہیں۔

چوتھا دور

دُوسری صدی کے نِصف سے پانچویں صدی کے نصف تک

اس دَور میں محدثینِ کرام کی ذمہ داریاں دو چند ہوگئیں۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ جعل سازوں کی طالع آزمائیوں نے جن وضعی حدیثوں کو جنم دیا تھا ان کا ابطال کرنا تھا اور دوسرا یہ کہ احادیث چہار سو سے جمع ہونے لگیں۔ اب محدثین کو ان سب کا حفظ کرنا اور ان کے حُسن و قبح میں نگاہ پیدا کرنا تھا۔

وضعِ حدیث

وضعِ حدیث کے دن اگرچہ مختصر تھے لیکن نہایت غور طلب اور عبرت آموز تھے۔

تخلیقِ حدیث کا فتنہ خلافتِ راشدہ کے اواخر ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلافت کے آخری تین سالوں میں آپ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلایا گیا۔ حضرت علیؓ کا دورِ خلافت شروع سے آخر تک مخالف گروہوں سے جنگ آزمائی میں گزر گیا۔ اس عرصہ میں بعض فتنہ پردازوں نے اپنے اپنے گروہوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے حدیثیں گھڑیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا نئے نئے گروہ پیدا ہوتے گئے۔ سیاسی لحاظ سے بھی گروہ بندی ہوگئی اور وضعِ حدیث کے فتنہ کو بال و پر نکالنے کے لئے فضا ملتی گئی۔

وضعِ حدیث کے کئی اسباب تھے مثلاً:

(۱) اسرائیلیات۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسرائیلی روایات کی اجازت محض تاریخی مطالعہ اور عبرت اندوزی کے لئے دی تھی۔ یہ روایات نہایت

دلچسپ تھیں - اس لئے ان کی کثرت ہو گئی - ان کو دین میں حجت حاصل نہ تھی لیکن بعض لوگ بے احتیاطی سے انہیں صحیح حدیث کا رتبہ دے دیتے تھے - ان میں جعلی روایات کی کمی نہ تھی -

(۲) مذہبی فرقے - اسلام میں کئی مذہبی فرقے اُٹھے، مثلاً خوارج، مُعتزِلہ، قدریّہ، وغیرہ - ان میں جو گروہ سب سے بڑھ کر جھوٹ کا دشمن تھا وہ خوارج کا تھا - لیکن خوارج بھی اپنے فرقہ کی تائید میں حدیثیں گھڑ لیتے تھے - ان کے ایک عالم نے توبہ کی تو اقرار کیا کہ جب ہمیں کوئی بات منظور ہوتی تو اسے حدیث کے طور پر پیش کر دیتے تھے -

(۳) زِندیقوں اور گمراہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہزاروں عجیب وغریب حدیثیں بنائیں تاکہ دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک پیدا ہو جائیں - زَنادِقہ کو عباسی حکمرانوں نے چن چن کر ٹھکانے لگایا -

(۴) قصّہ گوئی - قِصہ سرائی کسی زمانے میں پیٹ پالنے کا ایک وسیلہ تھی - قِصّہ گو نہ صرف بازاروں میں بلکہ مسجدوں میں بھی اپنا کمال دکھایا کرتے تھے - افسانوں میں حقیقت کا رنگ دکھانے کے لئے بعض داستان گو حدیثیں گھڑنے سے بھی نہیں چوکتے تھے - حضرتِ اَحمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن مَعینؒ نے ایک مسجد میں نماز پڑھی - ایک واعظ نے اٹھ کر حکایت بنجی شروع کی اور احمد اور یحییٰ کے حوالہ سے بیس صفحوں کی حدیث پڑھ ڈالی - یہ دونوں صاحب دم بخود ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے - وعظ ختم ہوا تو مقرر نے پیسے جمع کئے - جناب یحییٰ اسے ایک طرف لے گئے اور یہ مکالمہ ہوا:

یحییٰ - میں یحییٰ ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں - ہمیں تمہاری بیان کردہ حدیث کا علم نہیں -

واعظ - کیا تم یحییٰ بن مَعین ہو؟

یحییٰ - ہاں -

واعظ - میں ہمیشہ سنتا تھا کہ یحییٰ بے وقوف ہے - حقیقت آج کھلی -
یحییٰ - تم نے کیسے جانا کہ میں بے وقوف ہوں ؟
واعظ - کیا دنیا میں دیگر احمد اور یحییٰ نہیں ؟ میں نے ان ناموں کے اُنیس آدمیوں سے حدیث سنی ہے -

حضرت احمد بن حنبلؒ نے منہ ڈھانپ لیا اور یحییٰ سے کہا کہ اسے جانے دو - واعظ نے انہیں تمسخر کی نگاہ سے دیکھا اور چل دیا -

(۵) نسلی عصبیّت - اسلامی علاقوں میں سیاسی چپقلش کے سایہ میں کہیں کہیں نسلی عصبیّت نے بھی بساط پھیلائی - بعض خرافاتیوں نے اپنے اپنے شہر اور قوم کی منقبت میں حدیثیں تصنیف کیں -

(۶) شاہانِ وقت کی مدح سرائی - بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کی ستائش میں ابن الوقت طبّاعوں نے خوب مسالا پیدا کیا - حضرت معاویہؓ کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول منسوب کیا کہ قیامت ہوگی تو ستر برس تک معاویہؓ مجھے نظر نہیں آئیں گے - آخر ایک دن دیکھوں گا کہ کستوری کی ناقہ پر سوار چلے آتے ہیں - میں پوچھوں گا، معاویہ کہاں سے آتے ہو ؟ وہ جواب دیں گے کہ میں عرش کے نیچے ایک باغ میں تھا اور اللہ سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا - بنو عبّاس کی مدح میں یہ حدیث تخلیق ہوئی کہ اے عباسؓ! ۱۳۶ کا سال تمہارا اور تمہاری اولاد کا ہوگا - تمہاری اولاد میں سفاح، منصور اور مہدی ہوں گے - حدیثیں تاجداروں کی تائید ہی میں موزوں نہیں ہوئیں بلکہ حریفوں نے ان کی مذمت میں بھی وہ وہ فقرے تراشے کہ الامان -

(۷) نادانوں کی دوستی - دین کے بعض نادان دوست نیکی اور خوش عقیدگی کے جذبے جھوٹ بول جاتے تھے، حالانکہ شرافت میں معروف ہوتے تھے - ان کے زہد اور تقویٰ کو دیکھ کر لوگ ان کی تخلیقات کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے - عوام کو ایمان کی رغبت دلانے

کے لئے ایک صاحب نے حدیث بنائی کہ مومن کے وضوء سے جو پانی بچتا ہے اس میں ستّر بیماریوں کی دوا ہوتی ہے۔ قرآن کے فضائل میں ایک طومار لگ گیا۔ ایک شخص نوح نامی نے ایک ایک سورت کی فضیلت میں روایات گھڑیں۔ اور اعتراف کر گیا کہ میرا مدعا یہ تھا کہ لوگ قرآن کو پسِ پشت ڈال کر محمد بن اسحاق کی کتاب اور ابو حنیفہؒ کے فقہ پر لٹّو نہ ہو جائیں۔ امام ابو حنیفہ کے ایک خیر خواہ نے حدیث جوڑی کہ میری امت میں ایک شخص آئے گا جس کا نام ابو حنیفہ ہو گا۔ وہ میری امت کا چراغ ہو گا۔

(۸) ہنگامی ضرورت۔ حدیث کی وقتی حاجت نے بھی بعض زندہ دلوں کو حدیث سازی پر مجبور کیا۔ سعد بن ظریف کا بیٹا روتا روتا آیا۔ پوچھا، کیا بات ہے؟ کہا، مجھے معلم نے پیٹا ہے۔ بولے، اچھا، میں اسے سمجھوں گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ بچوں کے اساتذہ بدترین لوگ ہوتے ہیں۔

(۹) نمائشِ علم۔ بعض نام نہاد عالم اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے یا تبحرِ علمی کا سکہ جمانے کے لئے ضعیف متن کے لئے مشہور اور قوی سند گھڑ لیا کرتے تھے یا ضعیف سند میں کمی بیشی کر دیتے تھے۔

پوشیدہ دشمنوں اور نادان دوستوں میں بعض ایسے تھے جنہوں نے ہزاروں خانہ ساز روایات نشر کیں۔ سلیمان بن حرب ایک صاحب کے پاس گئے تو دیکھا کہ آنسو ٹپک رہے ہیں۔ سبب پوچھا تو بتایا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں ڈھال کر رائج کر دیں۔ اللہ جانے میرا کیا انجام ہو گا۔

کچھ شاہانِ وقت کی مساعی سے اور زیادہ تر علمائے کرام کی دیدہ ریزی اور جاں فشانی سے اس فتنہ کا جادو ایسا ٹوٹا کہ اسے سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔[۱]

---

[۱] وضع حدیث کے موضوع پر ان کتب سے استفادہ کیا گیا، مدخل حاکم۔ تذکرۃ الموضوعات از محمد طاہر ہندی۔ مقدمہ مسلم۔ ترمذی کتاب النکاح و کتاب العلل۔ اللآلی المصنوعہ از سیوطی۔ البدایہ والنہایہ۔

فنِ حدیث کی تکمیل

سابقہ دور میں فنِ حدیث کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس وقت یہ فن زیادہ متنوع نہ تھا لیکن ضرورت کے لحاظ سے بہت کافی تھا۔ زیادہ قواعد اور باریکیوں کی حاجت تھی۔

احادیث وسیع پیمانہ پر جمع ہوئیں۔ ان میں صحیح و سقیم کے بھی ڈھیر تھے۔ انہیں تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ سندوں کی ایسی جانچ ہوئی کہ باریک سے باریک سقم بھی بے نقاب کر دیا گیا۔ راویوں کی تحقیق کے لئے ان کے حالات جمع کئے گئے اور اَسْمَاءُ الرِّجَال یعنی بایوگرافی کا فن وجود میں آیا جس کا نشان اس سے قبل کسی قوم میں نہیں ملتا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ اشخاص کے حالات جمع ہوئے اور یہ فیصلہ آسان ہو گیا کہ کون راوی اعتبار کے قابل ہے اور کون نہیں۔ راویوں کے تقدم و تاخر اور معاصرت کی ٹوہ بھی لگ گئی۔ اگر راوی نے کسی روایت میں بھول چوک سے یا جان بوجھ کر ایسے شیخ کا نام لیا جو اس سے قبل وفات پا چکا تھا یا اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی تو اسماءُ الرّجال کی مدد سے اس کی نشان دہی ہو جاتی تھی۔ ایسی حدیث کو مُنقَطَع کہتے تھے۔ اگر کسی راوی کا حال کھل ہی نہیں سکا تو محدثین اسے مجہول الحال کہہ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کی روایت بھی منقطع ٹھہرتی تھی۔ فنِ رجال پر سب سے پہلی کتاب یحییٰ بن معین (۱۵۸-۲۳۳) نے لکھی[1]۔

اس دوران میں حدیثوں کے طُرُق بڑھ گئے۔ بعض احادیث کی سو سو سندیں جمع ہوئیں۔ ایسی حدیثوں کے متُون میں کہیں فرق نظر آتا تو ان کا آسانی سے موازنہ و مقابلہ ہو سکتا تھا اور حدیثوں کے درجے متعین ہو سکتے تھے[2]۔

الغرض حدیث کے فن نے تکمیل کے آخری مراحل طے کئے۔ اس کی باریکیاں انتہا کو پہنچیں اور تحقیق و تنقید کے سائنٹفک اصول وضع ہوئے۔ سابقہ دور میں ایک عالم کے لئے یہ ممکن تھا کہ حدیث اور فقہ دونوں پر برابر کا اقتدار رکھ سکے۔ لیکن اب حدیث کی ذمہ داریاں بہت کڑی اور متفرع ہو گئیں۔ عام علماء کے لئے مشکل ہو گیا

---

[1] بستان المحدثین [2] حجۃ اللہ البالغہ

کہ حدیث اور فقہ دونوں شعبوں میں مختص ہوں۔ محدثین کا اب ایک الگ گروہ قائم ہوا۔ گذشتہ محدثین کے پاس اوسطاً ایک ایک ہزار حدیث کے لگ بھگ کا سرمایہ ہوتا تھا۔ لیکن اب حدیث کا دامن پھیلا، واسطے بڑھے اور طُرق شاخ در شاخ ہو گئے۔ اس لئے محدثین نے چالیس چالیس ہزار حدیثیں حفظ کیں۔ ایسے بے نظیر اصحاب کمال بھی تھے کہ انہیں چھ چھ سات سات لاکھ روایتیں نوکِ زبان تھیں۔

اَقسامِ کُتُبِ حدیث

اسناد اور روایات کے ان انباروں کو محض حافظہ کے بھروسا پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ انہیں کتابوں میں جمع کیا گیا۔ ان مجموعوں کی طرز یکساں نہ تھی۔ محدثین نے اپنے اپنے اسلوب سے ان کو مرتب کیا۔ ان کی الگ الگ قسمیں قرار پائیں مثلاً

جُزء (یا مُفرد) اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں فقط ایک شخص کی روایات جمع ہوں۔

مُسنَد۔ جس میں احادیث کو الگ الگ صحابہؓ کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہو۔

مُعجَم۔ جس کی احادیث شیوخ (اساتذہ) کے اعتبار سے مرتب ہوں۔

سُنَن۔ جس میں صرف اَحکام کی احادیث جمع ہوں مثلاً جامع بخاری اور جامع مسلم۔

مُستَدرَک۔ جس میں کسی دیگر کتاب کی شروط کے موافق احادیث جمع ہوں۔ گویا اس کتاب کا تتمہ ہوتی ہے۔

مُستَخرَج۔ جس میں کسی دیگر مجموعہ کی احادیث کو علیحدہ سندوں کے ساتھ پہلے مجموعہ کے مؤلف کے واسطہ کے بغیر روایت کردیا جائے جیسے صحیح اسمٰعیلی، صحیح بخاری پر اور صحیح ابو عَوانہ، صحیحِ مسلم پر مستخرج ہیں۔

رِسالہ۔ جس میں کسی خاص موضوع کی احادیث ہوں۔

اَربَعین۔ چالیس احادیث کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

کتابتِ حدیث
(۱) ہمہ گیر کتب کا آغاز

محدثین کرام اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں حدیثیں اکٹھی کرنے کی تگ و تاز میں مصروف ہوئے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اطراف و اکناف میں طویل اور دشوار سفر کئے۔ جہاں سے کوئی روایت ملی اسے نہ صرف حافظہ کی لوح پر بلکہ کتاب کے اوراق میں بھی ثبت کیا۔ شاید ہی کوئی محدث ہو جس کے پاس چھوٹا یا بڑا تحریری نسخہ نہ تھا[۱]۔ بعض ضخیم مجموعے قلمبند ہوئے جن میں اکثریت مُسنَدوں کی تھی۔ بعض نمایاں تالیفات یہ تھیں:

مُصَنَّفِ عبدالرزّاقؒ (۱۲۶ - ۲۱۱ھ)

مُسنَدِ ابو داؤد طیالسیؒ (وفات ۲۰۴ھ)

مصنّفِ ابوبکر بن ابی شیبہؒ (وفات - ۲۲۵ھ)

مُسندِ احمد بن حنبلؒ (وفات - ۲۴۱ھ)

مسندِ عبد بن حُمیدؒ (وفات - ۲۴۳ھ)

مسندِ حارث بن اُسامہؒ (وفات - ۲۸۰ھ)

مُسند ابوبکر بزّازؒ (وفات - ۲۹۲ھ)

وغیرہ

ان میں مسندِ احمد بن حنبل بہت مقبول ہے۔ دیگر کتابیں فقط جمعِ حدیث کی مخلصانہ کوششیں ہیں ان کے مصنفین نے صحیح و سقیم روایات جمع کر دیں۔ ان کے سامنے مقصد یہ نہ تھا کہ صرف قابلِ عمل انتخاب مرتب کیا جائے[۲]۔ یہ مہم وہ اوروں کے لئے چھوڑ گئے۔

مُسنَدِ احمدؒ:- جناب احمد بن حنبلؒ ۱۶۴ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ ہجری میں وفات پائی۔ آپ کی مسند میں تقریباً ۳۰ ہزار حدیثیں ہیں۔ احادیث کا یہ سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ امام احمدؒ نے اسے ایک میزان ٹھہرایا تھا کہ جو حدیث اس میں نہیں وہ بے اصل ہے[۳]۔ یہ کتاب راویوں کی مُسنَدات کے لحاظ سے مرتب ہے۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ [۲] بستان المحدثین [۳] حجۃ اللہ البالغہ

کی مسند ہے جس میں صرف وہی احادیث ہیں جن کے راوی حضرت ابوبکرؓ تھے۔

اس مجموعہ کا غالب حصّہ حضرتِ امام احمدؒ نے خود جمع کیا۔ بعد میں ان کے بیٹے عبداللہؒ نے اپنی مرویات اس میں بڑھا دیں جو زیاداتِ عبداللہؒ کہلاتی ہیں۔ ان کے شاگرد ابوبکر قطیعی نے بھی اپنی مرویات اس میں درج کی ہیں وہ زیاداتِ قطیعی کہلاتی ہیں [۱]

مسندِ احمد بن حنبل کو ترمذی اور نسائی کے پہلو میں رکھا جاسکتا ہے۔

کتابتِ حدیث (۲) صحاحِ ستّہ

تیسری صدی کے نصفِ دُوم میں تنقیح کی مہم کا آغاز ہوا۔ بعض محدثین نے یہ بیڑا اٹھایا کہ اپنی کتاب میں حتی الوسع کوئی ضعیف حدیث نہیں لائیں گے۔ یہ مہم کامگار ہوئی اور چھ صحیح کتابیں لکھی گئیں جنہیں صحاحِ ستّہ کہا جاتا ہے۔ ان کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے۔

(۱) صحیح بخاری

یہ مجموعہ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ (۱۹۴ تا ۲۵۶ھ) کی تالیف ہے۔

حضرت امام بخاری کے والد بخارا کے ایک امیر تاجر تھے۔ امام بخاری کم سنی میں یتیم ہو گئے والدہ نے پرورش کی۔ آپ نے بے مثال حافظہ پایا تھا۔ تھوڑی ہی مدت میں متداول علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ طلبِ حدیث میں آپ نے حجاز، عراق، خراسان، شام اور مصر وغیرہ کے سفر کئے۔

آپ کو تقریباً چھ لاکھ احادیث یاد تھیں۔ ان کو چھانٹ کر ایک مجموعۂ حدیث مرتب کیا جس کا نام مختصراً الجامعُ الصحیح ہے لیکن عموماً صحیح بخاری کے نام سے معروف ہے۔ اس کو سولہ برس میں مکمل کیا۔ روضۂ نبوی کے پاس بیٹھ کر اس کو ابواب میں ترتیب دیا۔

امام بخاری سے قبل حدیث ان چار جداگانہ فنون میں مدون تھی: فقہ، تفسیر، سیرت، زہد۔ حضرتِ امام نے ان سب فنون کو الگ الگ ابواب کی ترتیب سے ایک کتاب میں اکٹھا کیا۔

احادیث کے انتخاب میں امام بخاری کے سامنے مندرجہ ذیل شروط تھیں:

(۱) سند متصل ہو۔

---

[۱] بستان المحدثین۔

(۲) راوی اور مروی عنہ کی ملاقات ثابت ہو۔
(۳) راوی ثقاہت میں مسلم ہوں [1]

(۲) صحیح مسلم

اس کتاب کے مؤلف امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ ہیں۔ آپ ۲۰۲ یا ۲۰۶ ہجری میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ ۲۶۱ ہجری میں وفات پائی۔ امام بخاری کے شاگرد تھے۔ آپ نے طلبِ حدیث میں اسلامی دیار کے کئی سفر کئے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں الجامع الصحیح کو بہت شہرت حاصل ہے۔ آپ کو تین لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ان میں سے وہ مرفوع و متصل حدیثیں جو فقہا کا مدارِ استنباط تھیں انتخاب کر کے الجامع الصحیح مرتب کی۔ کتاب کی ترتیب خوب ہے۔

امام مسلم نے حدیثوں کا انتخاب مندرجہ ذیل شرائط کے تحت کیا:

(۱) حدیث متصل ہو۔
(۲) راوی اور مروی عنہ ہم عصر ہوں۔ ان کی ملاقات کا فقط امکان کافی ہے۔
(۳) سب راوی ثقاہت میں مسلم ہوں۔
(۴) کم از کم دو تابعین نے دو صحابہؓ سے روایت سنی ہو۔
(۵) تمام محدثین کا اس حدیث پر اتفاق ہو۔

امام مسلم نے کتاب کے ابواب نہایت عمدگی سے باندھے ہیں تاکہ اذہان کے لئے قریب الفہم ہوں اور استنباطِ مسائل میں زحمت کم ہو۔ آپ نے فصول کے عنوانات خود قائم نہیں کئے۔ بعد میں حاشیوں پر لکھ دئے گئے ہیں۔

امام مسلم ہر حدیث کے متون اور اسنادات ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں تاکہ ایک تو یہ معلوم ہو کہ اس حدیث کا سلسلہ صحابی کے بعد کس طرح چلا ہے اور دوسرے

---

[1] صحیح بخاری کے عنوان کے لئے مرآۃ الجنان، نزہۃ النظر ابن حجر، رسالہ شاہ ولی اللہؒ اور بستان المحدثین سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مختلف متنوں کے بہ یک وقت پیش نگاہ آنے سے حدیث کا صحیح مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔[1]

بخاری و مسلم کا پایہ فن حدیث میں اس قدر رفیع ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں جہاں شیخین کا ذکر ہو وہاں مراد یہی دو امام ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم صحیحین کہلاتی ہیں۔ جو جو حدیث مسلم و بخاری ہر دو کے مجموعوں میں مشترک ہو اسے مُتَّفَق عَلَیْہ کہتے ہیں۔ یہ حدیث شک و شبہ سے بالا ہوتی ہے۔

بخاری و مسلم دونوں ہم پلہ ہیں۔ ان میں اَصَحِّیَّت کا پہلو ڈھونڈنا مشکل ہے۔ امام بخاری کے نزدیک قبولِ حدیث کے لئے راوی اور مروی عنہ کی طویل ہم نشینی لازمی ہے اس لئے وہ زیادہ سندوں کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ امام مسلم کے نزدیک دونوں کی ملاقات کا امکان ہی کافی ہے اس لئے تائیداً وہ کثرت سے سندات لاتے ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے صحیح مسلم فائق ہے۔

شیخین کی شروط کامل ترین سمجھی جاتی ہیں۔ بعد کے جامعین جب بھی ان شرطوں کے بموجب کوئی حدیث لائے ہیں تو فخر سے سر اونچا کیا ہے۔

صحیحین کی ایک بنیادی خوبی یہ ہے کہ ان میں صرف وہی احادیث پائی جاتی ہیں جن کی صحت پر خوب غور و خوض ہوا۔ کسی ایسے راوی کی حدیث نہیں لائے جس کی ثقاہت مسلّم نہ تھی۔ صحاح کی دیگر کتابوں میں اس درجہ کا اہتمام نہیں۔

(۳) سُنَنِ ابنِ ماجہ

ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینیؒ (۲۰۹ تا ۲۷۳ ہجری) نے کتاب السُّنَن کے نام سے ایک مجموعۂ احادیث مرتب کیا۔ آپ نے طلبِ علم میں جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ آپ کو لاکھوں حدیثیں حفظ تھیں جن سے سنن کی یہ کتاب انتخاب کی۔ آپ نے تاریخ اور تفسیر بھی لکھی لیکن صرف سُنن زندۂ جاوید ہوئی۔

---

[1] صحیح مسلم کے عنوان کے لئے نزہتہ النظر ابن حجرؒ، انصاف شاہ ولی اللہؒ، بستان المحدثین، مقدمہ صحیح مسلم اور تہذیب الاسماء نووی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا معیار صحاح کی دیگر کتابوں کو نہیں پہنچا۔ اس لئے بعض اصحابِ علم اسے صحاحِ ستّہ میں شمار نہیں کرتے اور اس کی جگہ موطّا یا سُننِ دارمی کو دیتے ہیں۔

اس کتاب پر علامہ سندھی نے ایک سیر حاصل حاشیہ لکھا ہے۔

(۴) سُننِ ابوداؤد

اس کتاب کے مؤلف ابوداؤد سلیمان بن اَشعَث سِجستانی ہیں۔ آپ ۲۰۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔ حدیث کی تلاش میں دُور دراز کی منزلیں طے کیں۔ ۲۷۵ ہجری میں بصرہ میں وفات پائی۔

امام ابوداؤد کو پانچ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ ان سے ۴۸۰۰ روایات انتخاب کر کے کتابُ السُّنَن مرتب کی۔ آپ نے وہ سب احادیث اکٹھی کر دیں جو فقہاء میں رائج تھیں۔ کتاب کی ترتیب فقہی عنوانوں سے ہے۔

اس کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں۔ لیکن مؤلف نے اس طور سے نشان دہی کر دی ہے کہ فنِ حدیث میں دستگاہ رکھنے والے تعمق سے دیکھیں تو بھانپ لیتے ہیں۔[1]

(۵) جامعِ ترمذی

یہ کتاب ابوعیسٰی محمد بن عیسٰیؒ کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ آپ ترمذ کے رہنے والے تھے جو ترکستان میں جیحوں کے کنارے واقع تھا۔ امام بخاری و مسلم اور ابوداؤد کے شاگرد تھے۔ طلبِ حدیث میں اسلامی دیار اور اَمصار کے سفر کئے۔

آپ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر رویا کرتے تھے کہ آخر نابینا ہو گئے۔[2]

آپ نے امام ابوداؤد کی طرح وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جو سوائے دو حدیثوں

---

[1] یہ عنوان انصاف اور بستان المحدثین سے مرتب ہے۔

[2] بستان المحدثین۔ مراۃ الجنان

کے کسی نہ کسی فقہی گروہ کے نزدیک واجب العمل نہیں[1]۔ البتہ اس میں تفسیرُ القرآن کا ایک وسیع باب ہے جو سننِ ابو داؤد میں نہیں۔

اس کتاب میں حدیثوں کی تعداد صحیحین کے مقابلہ میں کم ہے۔ یہ صرف حدیث کا مجموعہ نہیں بلکہ حدیث وفقہ کی معلّم بھی ہے۔ امام ترمذی نے اس میں بخاری ومسلم اور ابو داؤد سب کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مندرجۂ ذیل خصائص قابلِ ذکر ہیں:

(۱) راویوں کے حالات کے بارے میں جہاں ضروری سمجھتے ہیں معلومات بہم کرجاتے ہیں۔

(۲) سَنَد کے بارہ میں رائے دیتے ہیں اور اس کے صحیح، حَسَن یا غریب ہونے سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اتصال وانقطاع وغیرہ کی بھی خبر دیتے ہیں۔

(۳) بعض جگہ مختلف اسناد لاتے ہیں۔ وہاں اپنی ترجیح بیان کرتے ہیں اور دیگر اصحابِ علم کی آراء کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

(۴) حدیثوں سے جہاں جہاں فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں انہیں بیان کردیتے ہیں۔ ان کے بارہ میں ائمۂ مذاہب کا اختلاف ہو توان کے فتاوٰی درج کردیتے ہیں۔

(۶) سُننِ نسائی

یہ کتاب ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علیؒ (۲۱۴ تا ۳۰۳ ہجری) کی تالیف ہے۔ آپ نَسا کے شہر میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا نَسائی کہلاتے ہیں۔ فرموداتِ نبوی کی جستجو میں مدتوں رہینِ غربت رہے۔ آپ امام ابو داؤدؒ کے شاگرد تھے۔ پہلے مصر میں مقیم ہوئے اور پھر شام کی سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ وہاں حمص کے قاضی رہے۔ آپ کا مزارِ مبارک مکہ میں ہے۔ آپ حضرتِ علیؓ کے بہت مداح تھے۔ ان کے مناقب میں ایک کتاب لکھی تھی۔

---

[1] ترمذی کتاب العلل

سُننِ نسائی میں قوی حدیثوں کی کثرت ہے لیکن یہ کتاب صحیحین کے مرتبہ سے کم ہے۔ امام نسائی نے بعض راویوں کو محض اس لئے لے لیا کہ علمائے رجال اگر ان کی تعدیل میں متحد نہیں تو جرح میں بھی نہیں۔

پہلے آپ نے ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا۔ اس کا نام سُننِ کبریٰ تھا۔ اسے مختصر کیا اور نام سُننِ صُغریٰ رکھا۔ یہی اب سُننِ نسائی کے نام سے معروف ہے۔ اس میں زیادہ مواد عبادات پر ہے[1]

صحاحِ ستّہ کے ذیل میں سُننِ دارمی کا تذکرہ بھی لازمی ہے کیونکہ بعض اصحاب علم بجائے سُننِ ابن ماجہ کے اس کتاب کو صحاحِ ستّہ میں شمار کرتے ہیں۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے۔ شروع کے کئی صفحے حدیث کی اہمیت اور اس کی روایت و کتابت کے جواز پر ہیں۔ امام دارمی ۱۸۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ ہجری میں وفات پائی[2]

صحاحِ ستّہ میں سب سے پہلا درجہ صحیحین کا ہے۔ پھر ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کے مجموعوں کا[3] ابن ماجہ کی کتاب تیسرے درجہ میں ہے۔

کتابتِ حدیث
(۳) تکمیلی جہد

صحاح کی شرائطِ قبول بہت بلند تھیں۔ معیار قائم رکھنے کی خاطر یا سوالات سے بچنے کے لئے انہوں نے کئی ایسی صحیح حدیثیں چھوڑ دیں جن کا مرتبہ بلند نہ تھا۔ بعد کے جامعینِ حدیث نے ان کو بھی کتابوں کے سپرد کر دیا۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ جو حدیث بھی قابلِ قبول نظر آئے اسے محفوظ کر لیا جائے۔ ان کی مزید تحقیق مستقبل کے علماء انجام دے سکتے تھے۔ ان میں سے اہم کتابوں کے جامعین حسبِ ذیل ہیں:

امام ابویعلیٰ (وفات - ۳۰۷ھ) - آپ نے مُسند لکھی۔

امام طحاوی (وفات - ۳۲۱ھ) - آپ کی کتاب کا نام معانی الآثار ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ مستور الحال کی روایت کو بھی لے لیتے ہیں۔

---

[1] بستان المحدثین [2] بستان المحدثین [3] حجۃ اللہ البالغہ

ابنِ حِبّانؒ (وفات - ۳۵۴ھ)۔ آپ نے اپنی کتاب کا نام صحیح رکھا -

طَبرانیؒ (وفات - ۳۶۰ھ)۔ آپ نے تین مُعجم لکھے :

معجم صغیر - معجم کبیر - معجم اَوْسَط

امام دارِقُطنیؒ (۳۰۶ - ۳۸۶ھ)۔ آپ نے سُنَن لکھی۔

امام حاکِمؒ (۳۲۱ - ۴۰۵ھ)۔ آپ کی کتاب کا نام مُستَدرَک ہے۔

آپ نے بخاری ومسلم کی شروط کے موافق اُن احادیث کو اکٹھا کیا ہے جو صحیحین سے رہ گئی تھیں - یہ ایک لحاظ سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا تکملہ ہے - لیکن اس کا مرتبہ بخاری ومسلم سے بہت کم ہے - محض شرائطِ شیخین ہی کامیابی کی ضمانت نہیں - ان کا سا تبحرّ اور نگاہِ احتیاط بھی چاہیے - اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ بخاری ومسلم کی کتابوں میں جو حدیثیں آئیں وہ مدتوں ان کے اساتذہ کے زیرِ غور اور زیرِ تحقیق رہیں - بخاری ومسلم نے ان کو مزید جانچا، جب کہیں انہوں نے صحیحین میں جگہ پائی - [1]

امام بَیہَقیؒ (وفات - ۴۵۸ھ) آپ کی کتاب کا نام سُنَنِ کُبرٰی ہے - یہ ایک ضخیم کتاب ہے -

ان کے ماسوا دَیلمیؒ اور ابن خُزَیمہؒ نے بھی کتابیں تحریر کیں -

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

تعارفِ فقہ

از

شیخ محمدؒ اقبال

ایم۔ اے (عربی) ایم۔ اے (اسلامیات) ایم۔ اے (فلسفہ)
گورنمنٹ کالج لاہور

پبلشـــرز

علمی کتاب خانہ۔ اُردو بازار۔ لاہور

عنوانات

پیش لفظ ۵

باب اوّل

اصطلاحات ۷

باب دوم

مآخذِ فقہ ۱۲

کتاب اللہ ۱۵

سُنّت ۱۸

اجماع ۲۰

قیاس ۲۲

ضمنی مآخذ ۲۵

استحسان ۲۵

مُصالح مُرسلہ ۲۶

عُرف ۲۸

باب سوم

تدوینِ فقہ ۲۹

پہلا دور — عہدِ نبوت ۳۹

دُوسرا دور — خلافتِ راشدہ ۲۳

تیسرا دور — تابعینِ کبار ۳۶

چوتھا دَور ــ دوسری صدی کی ابتداء سے چوتھی صدی کے نِصف تک ۴۰
پانچواں دَور ــ چوتھی صدی کے نصف دوم سے زوالِ بغداد تک۔ ۴۷
چھٹا دور ۴۹

باب چہارم

مذاہبِ اربعہ ۵۱
اِمام اَبُو حنیفہؒ ۵۳
اِمام مالکؒ ۶۹
اِمام شافعیؒ ۸۲
اِمام احمد بن حنبلؒ ۹۱

پیش لفظ

اُردو زبان میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو اسلامی فقہ کا جامع اور مختصر تعارف پیش کر سکے کہ اسلامی فقہ کا مفہوم کیا ہے ؟ اس کا دائرہ کار کہاں تک ہے ؟ اس کے آغاز اور عہد بہ عہد رفتار کی رُوداد کیسی ہے ؟ فقہ کے جُداگانہ مکتب کیونکر قائم ہوئے اور مقبولِ عام مکاتبِ فقہ نے اسلام کی رُوح کو زندہ رکھنے کے لئے کیا خدمات انجام دیں ؟

اہلِ اسلام کے بعض حلقوں میں اسلامی فقہ سے متعلق عجیب غلط فہمیاں پیدا ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے مہلک اثرات سے ہمیں صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ زوالِ اُمّت کے اصل اسباب نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے ، ہم اپنی خوبیوں سے دست بردار ہونے میں بہتری دیکھیں گے اور دُوسروں کی نمائشی زیب و زینت قلب و نگاہ کا مقصود بن جائے گا۔

مَیں نے اس تالیف کی تیاری میں متعدد مستند کُتب کو پیشِ نگاہ رکھا ہے اور حقائق کی گہرائی تک پہنچنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کامیابی اور سرخروئی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس تالیف کا ہر لفظ شہادت دے گا کہ اس کی روش

محض علمی روش ہے۔ مقصد تعارفِ فقہ کے موضوع پر جامع مطالعہ پیش کرنا ہے، کسی فریق کی حمایت یا مخالفت میں زورِ قلم دکھانا نہیں ۔

مؤلف

بابِ اوّل

اصطلاحات

فقہ کے لغوی معنی ہیں:

(i) کسی چیز کو چاک کرنا۔ کھولنا

(ii) فطنت۔ سمجھ۔ فہم[1]

اصطلاح میں فقہ شرعی احکام کے علم کا نام ہے۔ بعض فقہاء نے اس تعریف کو زیادہ وسعت دی ہے اور کہا ہے کہ فقہ شریعت کے ان فرعی احکام کا نام ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہوں۔

(تفصیلی دلائل سے مراد ہے: اصولِ فقہ یعنی:
قرآن، سنّت، اجماع، قیاس)

قرآنِ حکیم میں فقہ کا لفظ کئی آیات میں آیا ہے اور سمجھ کے معنی رکھتا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝ (توبہ - ۱۲۲)

ترجمہ۔ ان کے ہر فرقہ میں سے ایک حصہ کیوں نہ نکلا تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں۔ اور جب اپنی قوم کی طرف واپس جائیں تو انہیں خبردار کریں تاکہ وہ بچتے رہیں (برائیوں سے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہ کا لفظ مطلقاً دینی سمجھ کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عباس کو دعا دی تھی: اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ[2]۔ اس حدیث

---

[1] لسان العرب [2] مسلم کتاب المناقب

کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ اے اللہ اسے سمجھ عطا کر۔ لیکن اس موضوع پر دیگر احادیث کو سامنے رکھا جائے تو ثابت ہو گا کہ فِقْہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دینی سمجھ مراد لیتے تھے۔ دینی مسائل میں سمجھ پیدا کرنے والے شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیہ کہا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: فَقِیْہٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ[1] (ایک فقیہ ہزار عابدوں سے بڑھ کر شیطان پر بھاری ہوتا ہے)

ابتداء میں فقہ فنی تکلفات سے بے نیاز تھا۔ صحابہؓ اور تابعینؒ شریعت کی روح سے سیراب تھے۔ وہ انسانی ذہن کے ساختہ اصول و قواعد کی مدد کے بغیر ہی وجدانی طور سے مسائل کا حل سوچ لیتے تھے۔ فِقْہ کا لفظ ان ایام میں سیدھے سادے معنی میں مستعمل رہا۔ جب فنون اور اصطلاحات کا دور چلا تو یہ لفظ ایک اصطلاح بن گیا۔ اس کے اصطلاحی معنی اس باب کی ابتداء میں درج ہو چکے ہیں۔

اسلامی شریعت شخصی اور جماعتی زندگی کے دنیوی اور اخروی دونوں پہلوؤں کو محیط ہے۔ یہی وسعت فقہی حدود کی بھی ہے۔ فِقْہ کے کنارے عبادات اور انفرادی و اجتماعی فکر و عمل کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ فقہ صرف ملکی انتظامات، معاشی معاملات اور معاشرتی تعلقات ہی کو نہیں لیتا بلکہ کھانے پینے اور پہننے بلکہ اٹھنے بیٹھنے کے آداب کا بھی نگران ہے۔ اسلامی فقہ کو غیر اسلامی قانون سے یہی امتیاز حاصل ہے کہ (غیر اسلامی) قانون زندگی کے صرف ایک حصہ یعنی دنیا کو کاٹ کر الگ کر لیتا ہے۔ اور پھر اس میں بھی مزید انتخاب کرتا ہے۔ اسلامی فقہ زندگی کے حصے بخرے نہیں کرتا، اسے ایک وحدت جانتا ہے۔ فِقْہ کی نگاہ میں روحانی شعبہ کے ہمراہ مادی شعبہ کو بھی تقدس حاصل ہے، مثلاً اس کے نقطۂ نظر سے قانون کی پیروی ملکی یا اجتماعی فریضہ ہی نہیں بلکہ

---

[1] ترمذی ابواب العلم

دینی فریضہ بھی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دِہ ہونا ہے۔

اصولِ فِقہ وہ علم ہے جس میں احکام کی دلائل سے بحث ہوتی ہے۔

فقیہہ فقیہہ کا میدانِ عمل ازبس وسیع ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسے کثیر معلومات، سرعتِ فہم اور جودتِ فکر کے سہ گانہ اسلحہ سے آراستہ ہونا چاہیے۔ فقیہہ کی حیثیت کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ تشریعی احکام کا شارح ہوتا ہے اور دوسرے مُقَنِّن۔ احکام کی شرح کے قابل وہ جبھی ہوسکتا ہے کہ:

زبان میں کامل دسترس رکھتا ہو۔
نُصوص سے بہ خُوبی آگاہ ہو۔
سند لانے کی اہلیت رکھتا ہو۔
دلائل کے مقابلہ و ترجیح کے ملکہ سے بہرہ مند ہو۔

مُقَنِّن کی حیثیت میں اسے ایک متوازن اور روشن فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سب اوصاف کے ساتھ اس میں ایک بنیادی وصف یہ ہونا چاہیے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو۔ اسلام میں علم کا حرفِ اوّل اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔

اِجتہاد اجتہاد کے لُغوی معنی ہیں:

کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے انتہائی جِدّ و جُہد کرنا۔

شرع میں اجتہاد کی تعریف یہ ہے:

قرآن و سنت کی رُو سے کسی مسئلہ کا حل نکالنے میں کوششِ بلیغ کرنا۔

مجتہد میں درجِ ذیل اوصاف کا ہونا لازمی ہے۔

۱۔ عربی زبان کا ماہر ہو۔
۲۔ کتاب و سنّت کے احکام میں گہری نگاہ رکھتا ہو۔
۳۔ احادیث کے صحت و سقم اور مدارج کی پہچان رکھتا ہو۔

۴۔ صحابہ و تابعین کے اجماعی اور اختلافی مسائل سے باخبر ہو۔

۵۔ قیاس اور فرعی دلائل مثلاً استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ کی حکمت اور قواعد سے آگاہ ہو[1]

محدث۔ مجتہد | محدث احادیث کو جمع کرتا ہے اور ان میں غور و خوض کر کے ان کی صحت و ضعف پر حکم لگاتا ہے۔ مجتہد حدیث کے الفاظ و عبارات میں غور و فکر کر کے احکام کا استنباط کرتا ہے[2] محدث ہر نوع کی احادیث کو لیتا ہے، مجتہد کی غرض فقط احکامی احادیث سے ہوتی ہے۔

ظاہر۔ نصّ | وہ کلام جس کے معنی سنتے ہی سمجھ میں آجائیں ظاہر کہلاتا ہے۔

جو کلام ظاہر سے قطع نظر بھی کوئی مقصود PURPORT رکھتا ہو اسے نَصّ کہتے ہیں۔ نص کا لفظ صرف قرآن اور حدیث کی عبارت کے لئے آتا ہے۔ ظاہر اور نَص دونوں ایک کلام میں جمع ہو سکتے ہیں۔

عامّ۔ خاصّ | عام و خاص دونوں ایک ایک معنی پر دلالت کرتے ہیں فرق یہ ہے کہ عام میں وسعت زیادہ ہے۔ یہ سب ہم نوع یا ہم جنس اشیاء کو شامل ہوتا ہے۔ لفظ خاص میں وسعت ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ اس کی دلالت فقط معین چیز تک محدود ہوتی ہے۔

مطلق۔ مقیّد | مطلق وہ حکم ہے جو کسی شرط سے مشروط یا وصف سے متصف نہ ہو۔

مقیّد شرط یا وصف میں محدود ہوتا ہے۔

شرط۔ رکن | شرط حکم کی حقیقت سے خارج ہوتی ہے۔

رکن حکم کا جزو ہوتا ہے۔

احکام کی تقسیم | فرض۔ وہ حکم ہے جو قطعی طور سے ثابت ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں پایا جاتا۔

واجب۔ وہ حکم ہے جو ظنّی طور سے ثابت ہو یعنی اس میں کچھ شبہ رہ جائے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ [2] مصفّٰی

سُنَّت ۔ سنّت کا لفظ عموماً سنّتِ مؤکّدہ کے لئے آتا ہے یعنی وہ عمل جس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے دوام فرمایا ہو، لیکن عذر کی بنا پر ایک دو بار چھوڑ بھی دیا ہو۔ فرض کے بالعکس اس کی قضاء نہیں ہوتی۔

مُستحَبّ (یا مندوب) ۔ وہ عمل ہے جس کی پابندی ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نہ فرمائی ہو۔ اس کی پیروی میں فضیلت ہوتی ہے، عدمِ پابندی کی صورت میں عِقاب یا عتاب نہیں۔

حرام ۔ مکروہ جس چیز سے اسلام نے باز رہنے کا حکم دیا ہے اسے حرام یا مکروہ کہتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ حرام دلیلِ قطعی سے ثابت ہے، مکروہ کا یہ درجہ نہیں۔

مُباح جس کے اختیار کرنے میں ثواب نہ ہو اور ترک کرنے میں گناہ نہ ہو۔

باطِل ۔ فاسِد باطل اور فاسد میں فرق یہ ہے کہ باطل (void) کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور فاسد کے بُرے اثرات ہوتے ہیں۔

قضاء ۔ اِفتاء اسلامی عدالت کا فیصلہ قضاء کہلاتا ہے۔ اس میں فقط ظاہر پر حکم لگایا جاتا ہے۔

افتاء عوام کی رہنمائی کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ظاہر اور باطن دونوں ہوتے ہیں۔

بابِ دوم

مآخذِ فقہ

انسان کو جس وصف نے دیگر حیوانات سے منفرد کیا ہے وہ اس کی عقل وتمیز ہے۔ عقل اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے دیگر عطیات کی طرح اس کا صحیح اور جائز استعمال ہی اسے مفید بنا سکتا ہے۔ اگر عقل کا تسلط جائز حدود سے آگے نکل جائے تو منزل سے رُخ پھیر دیتی ہے۔

عقل اپنے گوناگوں منافع کے باوصف ازبس محدود ہے۔ نبیؑ کے سوا دنیا کا کوئی انسان دیگر انسانوں کی رہنمائی کے بغیر صحیح قدم نہیں اٹھا سکتا۔ مملکت کے حاکمِ اعلیٰ کو بھی مشیروں اور صلاح کاروں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی مدد کے بغیر وہ حکومت کا کاروبار ایک دن بھی درست نہیں رکھ سکتا۔ مَہد سے لے کر لحد تک کسی نہ کسی انسان کی رہبری اور تعلیم و تربیت ہماری دمساز رہتی ہے۔ ورنہ اور تو اور ہم اپنی زبان سے کام لینا بھی نہ سیکھ سکیں اور گونگے رہ جائیں۔ کوئی فردِ بشر اس رہنمائی اور تربیت سے مستغنی نہیں رہ سکتا۔ یہ حقیقت انفرادی سطح ہی پر نہیں، بلکہ اجتماعی سطح پر بھی کار فرما رہتی ہے۔ کسی قوم کا کاروان امیر کے بغیر منزل کی طرف جادہ پیما نہیں ہو سکتا۔ جس قوم کا ایک لیڈر پر اتفاق نہیں ہوتا وہ انتشار، پراگندگی اور فساد کا شکار ہو جاتی ہے۔ لیڈر قوم کا دل و دماغ ہوتا ہے جس کے بغیر قوم سرگشتہ رہتی ہے، لیکن

لیڈر کے بارہ میں بھی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ کل وہ کوئی ایسی خوفناک غلطی نہیں کر بیٹھے گا جو قوم کو تباہی کے حوالے نہ کردے۔

یہ صفت اللہ تعالیٰ ہی سے مختص ہے کہ وہ خطاؤں اور غلطیوں سے پاک ہے۔ کوئی انسان چاہے کتنی ہی عظمت اور صلاحیت کا مالک کیوں نہ ہو آئے دن چھوٹی بڑی غلطیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ یہی حال جماعتوں اور ملتوں کا ہے۔ تجربات کی دنیا ہر لمحہ ہمارے لئے اس اٹل حقیقت کے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اشخاص ہوں یا جماعات، عقل و فکر کی کوتاہیاں اور لغزشیں ان کے سر پر منڈلاتی رہتی ہیں اور انہیں ہر لحظہ ایک مافوق البشر قیادت کی احتیاج رہتی ہے۔ اقوام کے مسالک اور اعمال کا نتیجہ ایک دن میں برآمد نہیں ہوتا۔ اس کے عیاں ہونے میں بارہا ایک خاصی طویل مدت گزر جاتی ہے۔ اس لئے وہ اقوام جو اپنی بشری حکمت ہی کو کافی و وافی سمجھ کر کارگاہِ حیات میں اسی کا سہارا لیتی ہیں اگر ان کو وقتی طور سے کچھ کامیابیاں نصیب ہو بھی جائیں تو ان پر آنکھیں بند کرکے فریفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ تاریخ نے ایسی اقوام کے اوراق بار بار پلٹ کر ہمیں بتایا ہے کہ یہ ظاہری کامیابیاں درحقیقت کامیابی کے بہروپ میں تباہیاں ہوتی ہیں۔

ابنِ آدم کے لئے مافوق البشر رہنمائی کی ضرورت اسی قدر بدیہی اور لابدی ہے جس قدر زندگی کی دیگر بنیادی ضروریات مثلاً جسمانی اعضاء و قویٰ، ہوا، پانی، خوراک، لباس وغیرہ۔ یہ سب ضرورتیں اللہ تعالیٰ نے خود فراہم فرما دی ہیں۔ چوپایہ کے بچہ کو چلنا اور بطخ کے چوزہ کو تیرنا کون سکھاتا ہے؟ اس کی عقل؟ نہیں۔ یہ قدرت کا نادیدہ ہاتھ ہے جو جبلتوں (INSTINCTS) کی صورت میں ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ انسان صرف نقل و حرکت کا مجموعہ نہیں

کہ محض جبلتوں کی مدد سے اس کی کار برآری ہوتی رہے بلکہ اس کا جوہر رُوح ہے۔ اس کو روحانی دستگیری کی بھی ضرورت ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے چرند و پرند کو تو جینے کے ڈھنگ سکھا دیئے اور انسان کو مادی وسائل دے کر اندھیرے میں چھوڑ دیا ہوگا؟ نہ عقل اسے باور کر سکتی ہے اور نہ تجربہ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی علمی، اخلاقی اور روحانی رہنمائی اپنے ذمّے رکھی ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے مقدّس پیکروں اور ربّانی صحیفوں کی صورت میں آفرینشِ آدم سے جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی نوعِ انسان کی رہبری کے لئے بنیادی اور اصولی قوانین و احکام صادر کرتا رہا ہے۔ انسان خود یہ قوانین وضع کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے سامنے جب تک الہامی اصول نہ ہوں اس کا قانون ضرور مجلسی، نوعی، یا ملکی اغراض و اہواء سے متاثر ہوگا۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ جو اصول اور احکام صادر فرماتا ہے ان کے سامنے عالمگیر فلاح ہوتی ہے۔ وہ نسلی اور علاقائی عصبیتوں سے مبرا ہوتے ہیں۔

جب تک اقوامِ عالم کے باہمی روابط کم یا معدوم رہے اللہ تعالیٰ ہر قوم کے لئے الگ نبی بھیجتا رہا۔ لیکن جب دنیا کی منتشر اقوام میں ربط اور وابستگی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے کل عالم کے لئے یکتا، دائمی اور مکمل شریعت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے نازل کی۔ کوئی قوم اللہ کے آخری صحیفہ قرآن اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے غافل رہ کر فلاح یاب نہیں ہو سکتی۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور کردارِ مبارک سے قرآن حکیم کی قولی توضیح اور عملی تعبیر پیش فرمائی۔ اس لئے آپؐ کی سنّت بھی دین میں اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن

و سنت کے احکام تعداد میں کم ہیں اور زندگی کے مسائل بے کنار۔ ہر مسئلہ کا تیار حل قرآن و سنت میں نہیں ملتا۔ ان سے ہمیں بنیادی اصول کی رہنمائی میسر ہوتی ہے۔ ان کے خطوط پر ہر ممکن الوقوع مسئلہ کا حل تلاش ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ فقیہ نئے مسئلہ کی نظیر قرآن و سنت میں تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اسے قیاس کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ علماء کی جماعت کسی مسئلہ پر قرآن و سنت کی روشنی میں ایک متفقہ نتیجہ پر پہنچ جائے۔ اسے اجماع کہتے ہیں۔

قرآن، سنت، اجماع اور قیاس چار ایسے اصول ہیں جن پر امت کے سب علماء کا اتفاق ہے۔ انہیں مآخذ فقہ، اصولِ اربعہ، دلائل اربعہ یا دلائل تفصیلیہ کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ضمنی اصول بھی ہیں مثلاً استحسان استصلاح اور عرف۔ ان سب اصول پر ہم ذیل میں الگ الگ بحث کریں گے۔

کتاب اللہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ قرآن حکیم کی زبان و بیان اور انداز و اسلوب کا اعجاز، مضامین و معانی کی معجزہ کاری، اس کی پیش گوئیوں کی صداقت اور اس کے وصول کرنے والے نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کا لاریب اور ایمان افروز صدق اس دعویٰ کی روشن براہین ہیں کہ یہ کتابِ مبین اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی ایک ایک آیت اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کی نشانی ہے۔

قرآنِ حکیم کے سب احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرنا لازم ہے۔ یہ نہیں کہ بعض احکام مان لئے اور بعض کو رہنے دیا۔ قرآنِ حکیم کے کامل اتباع کی سعی ہی مادی فوز و فلاح سے ہمکنار کرتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس - ۵۷) - (اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے نصیحت اور سینوں کی شفاء اور ہدایت اور رحمت ان کے لئے جو صاحب ایمان ہیں)

قرآن یک لخت نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۲ برس ۲ ماہ اور ۲۲ دن میں اس کا نزول مکمل ہوا۔ قرآن حکیم کے بتدریج نازل ہونے کی فقہی حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اسلام سے قبل عرب کی دینی، معاشرتی اور اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں ایک انقلاب لانا مقصود تھا۔ یہ عظیم انقلاب ایک دن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے لئے مہلت اور تدریج کی ضرورت تھی مثلاً شراب ہی کو لیجئے۔ اس کی تحریم یک بارگی نہیں ہوئی۔ شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لئے اس کو درجہ بہ درجہ چھڑایا گیا۔ قرآن نے پہلے یہ بتایا کہ اس کا گناہ اس کے فائدوں پر بھاری ہے۔ جو لوگ محتاط تھے انہوں نے دامن چھڑا لیا مگر بعض اب بھی چمٹے رہے۔ دوسرا حکم نازل ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ اب شراب پینے والوں کی تعداد کم تر ہو گئی چند ماہ بعد جب حالات بخوبی سازگار ہو گئے تو اس پر آخری اور کاری ضرب لگائی گئی اور دوٹوک حکم ہوا کہ بس اب باز آجاؤ۔ طبیعتیں اس حد تک آمادہ ہو چکی تھیں کہ جونہی یہ اعلان ہوا شراب کے برتن ٹوٹ گئے اور یہ سیال متاع گلیوں میں بہتی نظر آئی۔

نزول قرآن کے مکمل ہونے کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی مثالی جماعت قائم ہو گئی۔ اس نے اپنے اندر اس قدر استعداد پیدا کر لی کہ نہ صرف عرب بلکہ بیرون عرب کو بھی اپنے سانچہ میں ڈھال لیا۔

قرآنی احکام فقۂ اسلامی کی بنیاد ہیں۔ یہ احکام ہماری زندگی کے تمام

پہلوؤں کے بارہ میں بنیادی اور اصولی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو صاحب علم ان کی فہم حاصل کرے اس کے لئے دیگر مسائل کا حل ہونا آسان ہوجاتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل - ۸۹)

(اے نبی! ہم نے تیری طرف کتاب بھیج دی جو ۔۔ اصولی لحاظ سے ۔ ہر شے کا واضح بیان ہے)

دیگر مقامات پر قرآن حکیم کو تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (ہر چیز کی تفصیل) اور تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ کہا گیا ہے۔ اس مفہوم کی اور بھی آیات ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن میں سب مسائل کے حل کے لئے بنیادی اصول اور احکام موجود ہیں۔ (انعام ۶ : ۱۱۴)

قرآن حکیم کے احکام کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

عبادات :۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ

تدبیر منزل (خانگی تدابیر) :۔ نکاح، طلاق، وراثت، غلامی وغیرہ

معاملات :۔ تجارت، خرید و فروخت، اقرار نامے، گواہی وغیرہ

سیاست مدن (شہریت اور تمدن کا حفظان) :۔ عدل اور تعزیرات وغیرہ

قرآنی احکام اسلام میں اصل الاصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ گویا ایک کسوٹی ہیں جن پر انسان اپنے کل اعمال کو جانچ سکتا ہے۔ ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن تمہارے حق ہیں (یعنی جب تم نیکی کرو) یا تمہارے خلاف (یعنی جب تم غلطی کرو) ایک واضح دلیل ہے[1]

ہمارے اعمال اور قضیوں میں فیصلہ وہی حق ہوتا ہے جو قرآن حکیم پر مبنی ہو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (حکم ۔ یا فیصلہ ۔ صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ہے) (یوسف ۱۲ : ۴۰)

---

[1] اربعین نووی بحوالہ مسلم

قرآنِ حکیم کا ایک اور ارشاد ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں) (مائدہ)

(۲) سُنّت

سنّت کے لُغوی معنی ہیں، راستہ یا راہِ عمل یا طریقِ کار۔ شرع میں سنّت سے مراد ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا آپؐ کا قول، عمل یا تقریر۔

تقریر سے یہاں مراد ہے برقرار یا بحال رکھنا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات کی یا کہی گئی یا آپؐ کے علم میں آئی اور آپؐ نے ممانعت نہ فرمائی۔

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو قرآن کی شرح فرمائی ہے اور دوسرے مستقل احکام بھی دیئے ہیں۔ بعض احکام آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوئے اور بعض آپؐ نے روحِ قرآنی کے مطابق اپنے اجتہاد سے صادر فرمائے۔ ہمارے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیان فرمودہ شرحِ قرآن اور آپؐ کے صادر کردہ احکام اسی طرح واجب العمل ہیں جیسے قرآنی احکام۔

سنتِ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آگاہی ہمیں حدیث کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ جس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان ہوا اسے حدیثِ قولی کہتے ہیں، جس میں فعل بیان ہوا سے حدیثِ فعلی کہا جاتا ہے۔ اور جس حدیث میں تقریر بیان ہوا سے حدیثِ تقریری کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں کئی ایسی آیات ہیں جو وضاحت سے بتاتی ہیں کہ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت تا قیامت واجب ہے مثلاً مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) (۴: ۸۰) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے

خود بھی اس موضوع پر قطعی ارشادات فرمائے ہیں۔ ان پر ہم نے مفصل بحث اپنی کتاب "تعارفِ حدیث" میں کی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو پوچھا، اگر تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش ہو تو اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا، کتابُ اللہ سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، اگر اس کا حل وہاں نہ ملے تو؟ عرض کیا، سنتِ رسول اللہؐ سے۔ فرمایا، اگر وہاں بھی نہ ملے تو؟ عرض گزار ہوئے کہ پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا، شکر ہے اللہ کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کو رسول اللہ سے موافقت کی توفیق دی ہے[1] حجۃ الوداع کے خطبات کے دوران میں آپؐ نے ملت سے خطاب فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ کتاب اللہ اور اپنی سنت۔ انہیں تھام رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث عمل کے لحاظ سے کتابُ اللہ کے مساوی ہے بشرطیکہ اس کا قطعی ثبوت میسر ہو۔ ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں ہیں:

مُتَواتِر۔ حدیثِ متواتر شک و شبہ سے بالا ہوتی ہے۔ اس سے انکار کفر ہے۔

مشہور۔ حدیثِ مشہور میں شبہ کا احتمال رہ جاتا ہے۔ اس سے انکار بدعت ہے۔

---

[1] دارمی باب الفتیا [2] موطا امام مالک۔ مستدرک حاکم

خبرِ واحد۔ خبر سے یہاں مراد حدیث ہے۔ متواتر اور مشہور حدیثوں کے سوا دیگر احادیث کو آحاد کہتے ہیں۔ محدث خوب غور و خوض اور تنقید کے بعد ہی ان کی صحت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر صحیح ثابت ہو جائیں تو ان پر احکامِ شرعیہ میں عمل واجب ہوتا ہے۔

حدیث کی پابندی اہلُ السنّت والجماعت کے سب گروہوں (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ) میں مساوی طور سے ہے۔ ان مذاہب کے اَئمّہ رائے سے ضرور کام لیتے تھے لیکن قرآن و حدیث کی حدود کے اندر رہ کر۔ ان میں سے کسی امام کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ حدیث پر رائے کو ترجیح دیتے تھے۔

اجماع

اجماع کے لُغوی معنی ہیں، اکٹھا یا متفق ہونا۔ فقہی اصطلاح میں اجماع سے مراد ہے علمائے امت کا اجتہاد کرکے کسی امرِ دینی پر اتحاد کر لینا۔

اجماع ہیئتِ اجتماعیہ کا ایک فطری تقاضا ہے۔ چرند و پرند کو دیکھو تو وہ بھی اکثر گروہ در گروہ نظر آئیں گے۔ پھر انسان جس کا ایک بڑا نوعی امتیاز ہی مجلسی جِبلّت ہے اس فطری تقاضے کو کس طرح رَدّ کر سکتا ہے۔ دینِ اسلام نے فقہی مسائل کے حل میں اِجماع کو بہت اہمیت دی ہے بشرطیکہ قرآن و سنّت سے تجاوز نہ ہو۔ امت کے علماء اگر ایک فیصلہ پر متحد ہو جائیں تو یہ فیصلہ ضرور حق ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَةٍ وَیَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ[1] (اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر مجتمع نہیں کرے گا۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جو شخص جماعت سے

---

[1] ترمذی ابواب الفتن

کٹ گیا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔) اجماع کا راز جماعت سے وابستگی میں ہے۔ جو شخص اجماع کا قائل نہیں وہ گویا امّتِ مسلمہ سے الگ ہے۔ جماعت کی پابندی پر قرآن و حدیث میں متعدد ارشادات آئے ہیں۔

اجماع کا قرآنی نام شُورٰی ہے۔ سورۂ شورٰی میں جہاں مسلمانوں کے چند اوصاف گنائے ہیں وہاں ان کا ایک وصف یہ بھی بتایا ہے وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ یعنی ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں[1]

اجماع اور شورٰی کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبرانہ بصیرت کے باوصف قرآن حکیم میں حکم دیا گیا ہے وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (کام میں مسلمانوں سے مشورہ کیجئے)[2]

ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اجماعِ صحابہ کو حجّت کا درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن امت کے اذہان میں اجماع کی اَساسی حیثیت راسخ کرنے اور اس کا طریقہ سمجھانے کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتظامی امور میں شورٰی کے اصول پر عمل فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے امیر مقرر کرتا تو عبد اللہؓ بن مسعود کو مقرر کرتا۔[3]

احادیث میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کر کے ان کی رائے کو قبول فرمایا۔ مثلاً اسیرانِ بدر کا فیصلہ،

---

[1] آیت ۳۸
[2] آل عمران آیت ۱۵۹
[3] ترمذی باب الجہاد و باب المناقب

جنگِ اُحد کے لئے جگہ کا انتخاب اور جنگِ خندق کے دوران میں صحابہؓ کی اس رائے کو منظور فرمانا کہ بنو غطفان سے صلح نہ کی جائے۔ آپ ضروری سمجھتے تو عورتوں سے بھی مشورہ کرتے تھے اور ان کی رائے قبول فرماتے تھے۔[1]

صحابۂ کرامؓ کے عہد میں بھی اجماع کو اصولِ فقہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کی ایک مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ اجماع وہی درست ہے جو شریعت کے بنیادی اصول کے تحت ہو۔ آپ کے زمامِ خلافت سنبھالتے ہی عرب بھر میں بغاوت بھڑک اٹھی۔ ایک باغی گروہ کا مطالبہ تھا کہ اگر ہم سے زکوٰۃ نہ لی جائے تو ہم اطاعت سے باہر نہ نکلیں گے۔ صحابہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو رائے دی کہ سرِ دست آپ اس مطالبہ کو تسلیم کر لیں کیونکہ ہر طرف فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ وحی ختم ہو چکی اور دین مکمل ہو لیا۔ اب اس میں کمی نہیں ہو سکتی۔ صحابۂ کرامؓ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔

اجماع کی دو قسمیں ہیں (۱) اجماعِ قولی اور (۲) اجماعِ سکوتی۔

اِجماعِ قولی۔ مراد ہے تمام علمائے امت کا متفقہ طور پر فتویٰ دینا۔

اجماعِ سکوتی یہ ہے کہ کوئی مجتہد ایک فتویٰ دے جو سب علماء کے علم میں آجائے اور اس کی تردید نہ کریں۔

قیاس قیاس کے لغوی معنی ہیں ایک کو دوسرے کے موافق منطبق یا مساوی کرنا۔[2]

---

[1] عیون الاخبار ابن قتیبہ کتاب اوّل صفحہ ۲۸

[2] انگریزی میں قیاس کا ہم معنی لفظ ANALOGY ہے۔

اصطلاح میں قیاس سے مراد ہے پیش آمدہ مسئلہ کی نظیر متماثل اوصاف کی بنا پر کتاب و سنت میں تلاش کر کے اس کے موافق حکم لگانا بشرطیکہ کوئی مُعارِض یعنی رد کرنے والی حجت نہ ہو۔

قیاس کے چار ارکان ہوتے ہیں:

(۱) مَقِیس:۔ وہ مسئلہ جس کا حل مطلوب ہو۔ اسے فَرع بھی کہتے ہیں۔

(۲) مَقِیس علیہ:۔ قرآن یا سنت کی نص جس کے مطابق فیصلہ کرنا ہو۔ اسے اصل بھی کہتے ہیں۔

(۳) عِلّت:۔ وہ معنیٰ مشترک جو مقیس اور مقیس علیہ کے درمیان اشتراک پیدا کرتا ہے۔

علّت کو علّتِ جامع، وصفِ جامع، وصفِ مشترک یا وجہِ شبہ بھی کہتے ہیں۔

(۴) حکم:۔ وہ فیصلہ جو قیاس کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہو۔

قیاس ایک نہایت احتیاط طلب اصول ہے۔ قیاس کرتے وقت ذیل کی شرائط ملحوظ رکھنی چاہییں:

(ا) قیاس کسی نص کے متعارض نہ ہو۔

(ب) اس کی وجہ سے نص کے کسی حکم میں تغیّر نہ آئے۔

(ج) علّت ایسی نہ ہو کہ عقل ادراک ہی نہ کر سکے۔

(د) علّت حکم شرعی کی بنا پر ہو، لغوی معنی کی بنیاد پر نہ ہو۔

(ہ) مَقِیس ایسا نہ ہو کہ اس کے بارہ میں کوئی نص موجود ہو۔

(س) ادنیٰ اشتراک کی بنا پر قیاس نہ کیا جائے۔

قیاس ہادیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فرمایا ہے۔ حجۃ الوداع

کے موقع پر ایک صحابیہؓ نے عرض کیا کہ میرا باپ بہت بوڑھا تھا۔ اس پر حج فرض تھا لیکن سواری پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج ادا کر دوں؟ آپؐ نے فرمایا، اگر تمہارے باپ پر قرض ہوتا تو کیا اسے ادا کرتیں؟ عرض کیا ہاں۔ ارشاد فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ کا قرض تو سب سے پہلے ادا کرنا چاہیے[1] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واجبُ الادا حج کو واجبُ الادا قرضہ کے مُشابہ قرار دے کر فیصلہ صادر فرمایا۔

صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے عہد میں قیاس پر بھی عمل تھا لیکن کوئی لگے بندھے قواعد نہ تھے۔ قیاس کا اصول سادہ طور سے برتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جناب ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ اگر ایسا قضیہ تمہیں تردّد میں ڈال دے جس کے بارہ میں قرآن و سنّت خاموش ہیں تو اس کی مثالیں اور ہم شکل صورتیں (قرآن و سنّت میں) تلاش کرو۔ ان پر اس قضیہ کو قیاس کرو اور پھر اس صورت کو انتخاب کرو جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ ترین ہو اور حق کے سب سے زیادہ مشابہ ہو[2]

قیاس ائمہ اربعہ کے نزدیک متفقاً تسلیم شدہ ہے۔ البتہ بعض علماء حتیّ الوسع اجتہاد سے بچتے تھے کہ غلطی سرزد ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہی کا یہی خوف بعض فقہاء کے دل میں اس طرح جاگزیں تھا کہ اگر ہم نے مسائل سے فرار کیا اور ان کا حل پیش نہ کیا تو اللہ کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ اس لئے وہ ہر

---

[1] اصول شاشی ص ۔ سیرت عمر بن الجوزی ۔ اعلام الموقعین ص ۔ ۱، عقد الفرید ص ۳۶

فرعی مسئلہ پر غور و فکر کرتے اور اس کا حل بتاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رح کا یہی مسلک تھا۔ انہوں نے بے شمار مسائل کا حل پیش کیا ہے۔ لیکن از بس محتاط تھے۔ جہاں حدیث مل جاتی قیاس چھوڑ دیتے تھے چاہے حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو[1] لیکن جہاں نصؔ نہ ہو وہاں قیاس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ آپ قیاس میں غلو نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت و فراست کے جوہروں سے مالا مال کیا تھا۔ اس لئے قیاس کی شرائط اور آداب کو خوب جانتے تھے۔

آپ اس قیاس کو باطل سمجھتے تھے جو ادنیٰ مشابہت پر مبنی ہو۔ مثلاً قیاسِ مناسب (جب اصل و فرع میں ادنیٰ مناسبت ہو) یا قیاس الشبہ (جب اصل و فرع میں صورت کی شباہت ہو جیسے تیل اور سرکہ) آپ کے نزدیک باطل تھا۔[2]

ضمنی مآخذ مآخذِ اربعہ کے علاوہ بعض ضمنی مآخذ بھی ہیں جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں!

استحسان - استحسان کے لغوی معنی ہیں پسند کرنا یا ترجیح دینا۔ فقہی اصطلاح میں استحسان سے مراد ہے قیاس کو چھوڑ کر اصولِ عامہ کو اختیار کرنا۔

مسائل کا حل بالعموم قیاس ہی سے حاصل ہو جاتا ہے لیکن بعض دفعہ قیاس اصولِ عامہ سے ٹکرا جاتا ہے۔ ایسے میں بعض فقہا اصولِ عامہ کو اختیار کرتے ہیں اور اسے استحسان کہتے ہیں۔

شریعت کی روح و رواں حکمتِ الٰہی ہے جس کا ادراک انسانی

---

[1] اعلام الموقعین ص ۴۲۔ جامع المسانید باب اول [2] مسند خوارزمی باب اول ص ۴۲

عقل سے وراء ہے۔ لیکن شریعت نے اس حکمت کے چند اصول خود بتا دئے ہیں۔ اور کچھ اصول اس کے احکام سے بھی مستنبط ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن بتاتا ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا) ۔ ایک اور ارشاد ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی پر امکان سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) ان ارشادات سے یہ اصول نکلتا ہے کہ کتاب و سنت کی تشریح اور قانون سازی میں وہ پہلو اختیار کئے جائیں جو دشواری کا باعث نہ ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارہ میں آیا ہے کہ جب آپ کے سامنے دو امور آتے اور آپ کو ان میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوتا آپ آسان پر عمل فرماتے۔ (۲: ۱۸۵) (۲: ۲۸۶)

شریعت کا ایک اور اصول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس حدیث میں ہے۔ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ (یعنی کسی کو ضرر نہ پہنچاؤ اور نہ اس کا بدلہ ضرر کی صورت میں دو) ۔ لہٰذا اس اصول کی رو سے اگر کوئی شخص کسی کو نقصان پہنچائے تو قانون مظلوم کو اجازت نہیں دے گا کہ وہ بھی ظالم کو نقصان پہنچائے بلکہ ہرجانہ دلوا دے گا۔

ان اصولِ عامہ کے برتنے میں یہ خیال رکھا جائے کہ کسی واضح نص کی مخالفت نہیں ہوتی۔ مثلاً قصاص کے معاملہ میں نص کی رو سے ظالم کو زخم کے بدلہ میں زخم لگایا جا سکتا ہے حالانکہ ظاہر بین نظر میں یہ لا ضرر و لا ضرار کے اصول کے منافی ہے۔

مَصَالِحِ مُرسَلہ یا اِستِصلاح

استصلاح سے مراد ہے، قیاس کو چھوڑ کر مصالح مرسلہ کو اختیار کرنا

مصالح مرسلہ کے معنی ہیں غیر معین مصلحتیں یعنی جن کا حکم کسی معین نص میں نہ ہو بلکہ قرآن اور سنت کے مجموعی تاثر سے ابھرتی ہوں۔

یہ اصول مالکیہ اور حنابلہ کا ہے۔ مالکیہ کے ہاں اس کا نام مصالح مرسلہ ہے۔ اور حنابلہ کے ہاں استصلاح۔ یہ اصول قانون ساز سے مطالبہ کرتا ہے کہ معاشرہ کی فلاح و بہبود کو سامنے رکھے اگر اس مقصد کے لئے افراد پر تنگی ہو جائے تو ملت کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر مستحسن ہوگی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ضحاک بن خلیفہ نامی نے مدینہ کی ایک وادی سے نہر نکال کر محمد بن مسلمہ کی زمین سے لے جانا چاہی۔ محمد بن مسلمہ نے انکار کیا۔ ضحاک نے بہت اصرار کیا لیکن محمد بن مسلمہ نہ مانے۔ ضحاک نے اس کا تذکرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا۔ انہوں نے ابن مسلمہ کو بلا کر ضحاک کے لئے نہر کا رستہ دینے کا حکم دیا۔ ابن مسلمہ نے کہا، نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ اپنے بھائی سے ایسی چیز کیوں روکتے ہیں جو آپ کو بھی فائدہ دے گی اور نقصان نہیں پہنچائے گی۔ ابن مسلمہ بولے، اللہ کی قسم! نہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اللہ کی قسم وہ نہر کو گزارے گا چاہے تمہارے شکم سے ہو کر جائے۔ ضحاک نے حسب فیصلہ نہر گزار لی[1]

استصلاح کا اصول ایک وسعت انگیز اور ترقی بخش اصول ہے لیکن اس کی حدود پر نگاہ رہنی چاہیے۔ اسے بہت زیادہ پھیلایا جائے تو عین ممکن ہے کہ احتیاط کا دامن چھوٹ جائے۔ انسانی مصالح کا تعین از بس مشکل ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو چاہو اور وہ تمہارے لئے شر ہو اور عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بھلی ثابت ہو۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب الاقضیہ

استصلاح کا اصول نتائج کے اعتبار سے استحسان سے جدا معلوم نہیں ہوتا۔ مصالح مرسلہ ہوں یا اُصولِ عامۂ شریعت کی روح کو مدنظر رکھا جائے تو راہِ فکر میں اس فرق کے باوصف نتائج میں اختلاف کم ہو گا۔

عُرف لوگوں کی عادات اور مشترکہ اعمال و رسوم اگر نص کے خلاف نہ ہوں تو بحال رکھے جائیں گے۔ انہیں اصطلاح میں عُرف کا جامع نام دیا جاتا ہے۔ اگر عوامی رواج نص کے خلاف ہو تو ترک کر دیا جائے گا۔ البتہ عرف کے مقابلہ پر قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

باب سوم

تدوینِ فقہ

پہلا دور۔ عہدِ نبوت

ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی فقہ کی بنیادیں اس پختگی اور خوش اسلوبی سے ہموار ہوئیں کہ آئندہ کی نسلوں کے لئے ان بنیادوں پر فقہی اجتہاد کی عمارت کی تعمیر کچھ مشکل نہ رہی۔

قرآن حکیم اور رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایسے جامع اور عمومی کلیات و اصول اور احکام صادر فرمائے ہیں جن میں قیامت تک کے تمام ممکن الوقوع اور مختلف النوع مسائل کے حل کی بنیاد بننے کی صلاحیت ہے مثلاً

(ا) —— لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ○ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس آیت کی رُو سے عدالت صرف مجرم کو سزا دے سکتی ہے۔ اس کے کسی رشتہ دار کو بلا وجہ ماخوذ نہیں کر سکتی۔ (۳۸ : ۵۳)

(ب) كُلُّ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ (حدیث) جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔ اس حدیث کی رو سے جو معاہدہ بھی قرآنی اصول کے خلاف ہو وہ کالعدم ہوگا۔

عہدِ نبوت میں اجتہاد کا دائرہ کار واضح کر دیا گیا۔ اسلامی فقہ کے ماٰخذ یعنی کتاب اللہ، سنّتِ رسول، اجماع اور قیاس وغیرہ کا مقام و مرتبہ

متعین ہو گیا اور ان سے استنباط کرنے کا اجمالی طریق سمجھا دیا گیا جیسا کہ تصریحاتِ ذیل سے ظاہر ہو گا :-

(۱) کتاب اللہ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چالیس برس کی عمر میں نبوت پر فائز ہوئے ۔ قرآن حکیم کا نزول حضورؐ کی بعثت کے ساتھ ہی شروع ہوا ۔ اور تھوڑا تھوڑا کرکے کچھ اوپر بائیس برس میں تکمیل کو پہنچا ۔ قرآن حکیم نزول کے ساتھ ساتھ ذہنی اور تحریری طور سے محفوظ ہوتا گیا ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قرآنِ حکیم زبانی یاد تھا ۔ آپؐ نے کئی صحابہؓ کو بھی حفظ کرا دیا ۔

ابتداءِ اسلام میں عقائد کی اہمیت زیادہ تھی ۔ اس لئے شروع کی اکثر آیات عقائد سے متعلق تھیں — ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلام کا ذی اختیار معاشرہ قائم ہوا تو قوانین کی آیات بھی نازل ہونے لگیں ۔ اس تدریجی نزول کا سبب یہ تھا کہ اہلِ اسلام کے سامنے پہلے کوئی نظامِ حیات موجود نہ تھا ۔ انہیں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ نگرانی خود یہ نظام قائم کرنا تھا اور پھر اس کامل اور مثالی صورت میں کہ قیامت تک بنیاد کا کام دے ۔ اس مقصد کے لئے تدریجی ارتقاء کی ضرورت تھی ۔

قرآنِ حکیم اسلامی فقہ کی اساس ہے ۔ اس میں سب کلّی اور بنیادی احکام موجود ہیں ۔ انہی بنیادی احکام میں سے یہ ارشادات بھی ہیں کہ رسول اللہؐ تمہارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونۂ حیات) ہیں ۔ جس نے رسول اللہؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔

(۲) سنت رسول اللہؐ ۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اطہر بنی نوعِ بشر کے لئے ایک کامل معیارِ حیات ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عملی زندگی

کے تمام پہلو عطا کیے۔ مثلاً ایک خانہ دار شخص، ایک عبادت گزار ہستی، ایک حاکم، ایک معلم، ایک جرنیل، ایک سیاست دان وغیرہ کی حیثیت میں متعدد مناصب کے مالک تھے جنہیں آپؐ نے اس شانِ کمال سے نباہا کہ ایک دائمی مثالِ زیست مہیا فرما گئے۔

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ اول سے لے کر آخر تک فقہ کا ایک درخشاں صحیفہ ہے جو ۶۳ برس تک مرتب ہوتا رہا۔ آپؐ کا ہر قول، فعل، پسند اور ناپسند زندگی کے لیے درس ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ کو تاکید فرماتے رہے کہ میری پیروی کرو اور میرے اقوال یاد رکھو۔ لہٰذا انہیں آپؐ کی زندگی کی مکمل کتاب ازبر ہو گئی۔ سنت سے متعلق ایک معتد بہ ذخیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریر ہو گیا۔

(۳) اجتہاد۔ قرآنِ حکیم اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل کے استعمال کی بہت تاکید کی ہے۔ حضورؐ صحابۂ کرامؓ کو اجتہاد کا شوق دلاتے تھے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ فقط دو آدمیوں سے رشک ہو سکتا ہے۔ ایک تو مالدار شخص سے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور دوسرے صاحب حکمت سے جو حکمت سے فیصلہ کرتا ہے[1]۔

اجتہاد کی ایک شاخ قیاس ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ قیاس سے کام لے کر مسائل حل فرماتے تھے۔ اس سے صحابہؓ کو بھی قیاس کی تعلیم ہو گئی۔ اس وقت قیاس کا نام رائج نہ تھا۔ اس کا استعمال صرف ذوقی اور وجدانی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں صحابہؓ کے اجتہاد کی گنجائش محدود تھی۔ اس لیے اس عہد میں صحابہؓ کے فتوے بہت

---

[1] مسلم ۲ - ۱۰۱

کم ملتے ہیں۔

اجتہاد کی ایک اور شاخ اجماع ہے۔ قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو جماعتی زندگی اور باہمی مشوروں پر چلنے کی بہت تاکید کی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اجماع کی تعلیم فرمانے کے لئے صحابۂ کرامؓ سے انتظامی امور میں مشورے لیا کرتے تھے۔

علمِ فقہ کی تحصیل میں اصحابِ رسولؐ نہایت توجہ دیتے تھے۔ قرآنِ حکیم نے حکم دیا کہ قبائل کی تعلیم کے لئے گروہ تیار رہوں[1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے بھی بڑھ کر شیطان پر غالب ہوتا ہے[2] آپؐ کا ایک اور فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جس کی بھلائی منظور ہوتی ہے اسے دین میں سمجھ دے دیتا ہے[3] آپ نے یہاں تک تاکید فرمادی کہ لَا يَبِيعُ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّينِ[4] (ہمارے بازار میں سوائے اس شخص کے جس کو دین کی سمجھ ہے کوئی خرید و فروخت نہ کرے) تجارت قوم کی شاہرگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اگر تاجر ہی ضروری مسائل سے آگاہ نہ ہوں تو حشر معلوم۔ ان ارشادات نے صحابہؓ کے سمندِ شوق کے لئے تازیانہ کا کام کیا۔ اور بعض صحابہؓ نے فقہ میں بلند مقام پیدا کرلیا۔

فقہ اس وقت ایک عملی علم تھا۔ ایک صحابی کا قول ہے کہ جب ہم قرآنِ حکیم کی دس آیات پڑھ لیتے تو ان کا علم و عمل سمجھ کر آگے بڑھتے تھے (جمع الفوائد باب آداب العلم)

---

[1] سورۃ توبہ - ۱۲۲ [2] ترمذی ابواب العلم - دارمی باب الفتیا [3] دارمی باب الفتیا

[4] ترمذی کتاب الصلوٰۃ

دوسرا دور ــ خلافتِ راشدہ | صحابۂ کرامؓ کا دور عمل و سعی کا دور تھا۔ عقائد کا رنگ سادہ تھا۔ اس دور میں صرف ضروری اور پیش آمدہ مسائل پر توجہ تھی۔ تقدیری یعنی فرضی مسئلوں میں پڑنا معیوب جانتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہا لیکن جھجک کے مارے ایک برس تک جرأت نہ کر سکے[1] ایک شخص صبیغ نامی کو ایک ایسی آیت کے اسرار کی جستجو ہوئی جو متشابہات کے قبیل سے تھی۔ بصرہ سے چل کر حضرت عمرؓ کے پاس تشنگی بجھانے آیا۔ حضرت عمرؓ نے کھجور کی چھڑی سے پیٹ ڈالا۔

پیش آمدہ مسائل میں جہاں دقّت پیش آجاتی وہاں صحابۂ کرامؓ خوب غور و خوض کے بعد فتوای دیتے تھے۔ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے پاس کچھ آدمی ایک مسئلہ کے بارے میں جاتے رہے۔ انہوں نے ایک ماہ کی سوچ کے بعد جواب دیا[2] اس دور میں قرآن، سنّتِ رسول اللہؐ، اجماع اور رائے فقہ کے چار مآخذ مسلّم تھے[3]۔ صحابۂ کرامؓ کے اجتہاد اور رائے کو پہلی بار حجّت کا درجہ حاصل ہوا۔ حضرت عمرؓ قاضیوں کو ہدایت دیا کرتے تھے کہ کتاب اللہ، سنت، اجماع اور رائے سے مدد لو[4]۔ رائے یا اجتہاد کی شاخ قیاس کا ذکر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کیا اور اس کا قاعدہ بھی بتایا معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کی اصطلاح نے اس وقت زیادہ رواج نہیں پایا۔ رائے کا

۱؎ مسلم کتاب الطلاق باب فی الایلاء ۴ : ۱۹۰ ۲؎ اعلام الموقعین جلد اوّل ۳؎ سیرت عمر از ابن جوزی ص ۱۲۰ ۔ دارمی اور رسالہ انصاف شاہ ولی اللہ میں آپ کا مکتوب قاضی شریح کے نام اس موضوع پر دیکھو ۴؎ حضرت عمرؓ کا خط بنام ابو موسیٰ اشعری۔ سیرت عمر از ابن جوزی - ریاض النضرۃ از محب طبری اور عقد الفرید میں دیکھو۔

کا عمومی لفظ ہی رائج رہا۔ البتہ یہ لفظ بعض دفعہ فکری بے لگامی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

خلافتِ راشدہ میں اجماع کا بہم پہنچنا آسان تھا۔ صحابۂ کرامؓ کی تعداد زیادہ نہ تھی اور بیشتر مرکزِ خلافت یعنی مدینہ میں مقیم تھے۔ خلفائے راشدینؓ ان سے آئے دن مشورے کرتے تھے۔ بعض اہم مسائل میں تو کئی کئی روز مباحثے ہوتے رہے۔ لہٰذا اجماعی فیصلوں کی کثیر تعداد وجود میں آ گئی۔

اسلام آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کا روادار نہیں۔ دین کے دائرہ کے اندر ضمنی مسائل میں مجتہد کو رائے برتنے کا حق ہے۔ رائے کے استعمال سے بعض دفعہ اختلاف ہو جاتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے مابین بھی بعض جزوی مسائل میں اختلاف ہوا جو ان کی اپنی اپنی معلومات، طرزِ فکر اور طریقِ استنباط کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس اختلاف کے اسباب مندرجۂ ذیل تھے:

(۱) کسی صحابیؓ نے ایک مسئلہ میں اپنی رائے سے فتویٰ دیا حالانکہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث موجود تھی جس کا اس صحابی کو علم نہ تھا۔ یہ فتویٰ حدیث کے موافق نہ پڑا۔ کسی دیگر صحابیؓ کو اس حدیث کا علم تھا اس لئے انہوں نے اختلاف کیا۔

(۲) کسی صحابیؓ نے ایک حدیث سنی اور اس کی صحت کا یقین کر لیا۔ دوسرے صحابیؓ نے اس حدیث کے راوی کو تسلیم نہ کیا اور اپنی رائے سے فتویٰ دیا۔ لہٰذا اختلاف ہو گیا۔

(۳) کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کی نَصّ نہ ملی۔ ایک صحابی نے پیش آمدہ مسئلہ میں قیاس کیا اور دوسرے نے اصولِ عامہ کی رُو سے فیصلہ کیا اور مختلف نتیجوں تک پہنچے۔

(۴) بعض دفعہ قرآن حکیم کے کسی لفظ کی لُغوی تشریح محلِ اختلاف ہوئی۔
(۵) کبھی کسی حدیث کا مفہوم سمجھنے میں اختلاف ہوا۔
(۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض امور کے بارہ میں اتفاقِ رائے نہ ہو سکا کہ وقتی تھے یا دائمی۔
(۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض مباح امور میں ایک طریق یا قاعدہ کی پابندی نہیں فرماتے تھے۔ بعض صحابہؓ نے ان میں سے ایک صورت اختیار کی اور بعض نے دوسری۔

اس اختلاف کا تعلق اصول سے نہ تھا، فروع سے تھا۔ اس میں ہٹ دھرمی نہ تھی۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ میں سے جب کوئی اپنی رائے سے فتویٰ دیتا تو کہتا، اگر یہ فتویٰ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو میری طرف سے۔ حضرت عمرؓ نے مَہر کے بارہ میں ایک فتویٰ دیا۔ ایک عورت نے اٹھ کر اعتراض کیا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی رائے صحیح نظر آئی۔ فوراً مان گئے۔ حضرت علیؓ نے ایک شرابی کے چالیس کوڑے پٹوائے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے چالیس کوڑوں کی سزا دی تھی اور حضرت عمرؓ نے اسّی (۸۰) کی۔ یہ سب سُنّت ہیں۔ البتہ چالیس کی تعداد مجھے زیادہ پسند ہے[۱]۔ عوام جس صحابیؓ سے چاہتے فتویٰ پوچھ لیتے تھے کسی ایک مفتی کی تقلید لازم نہ تھی۔

اس دَور میں فتوحات کی وسعت دور دور تک پہنچی اور نو بہ نو مسائل اٹھے۔ ان کا تصفیہ ضروری تھا۔ اس لئے فقہی تعلیم کی ضرورت بڑھی۔ سرکاری معلّم مامور ہوئے اور تنخواہ دار مفتیوں کے عہدے قائم ہوئے۔ انتظامی عہدہ دار بھی فقیہ ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ فتاوٰی کی رفتار روز افزوں رہی۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی کا سامان جمع ہوا۔ اس دور کے فقہائے کے سرخیل خلفائے راشدینؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، عبد اللہؓ بن مسعود رضی۔

---
[۱] تاریخ ابن اثیر

اُبیؓ بن کعب اور ابو موسیٰ اشعریؓ تھے۔

تیسرا دور — تابعین کبار

اس دور کی مدت خلافتِ راشدہ کے اختتام سے پہلی صدی ہجری سے کچھ پار تک ہے۔

اس کے حسب ذیل خصائص تھے۔

(۱) **محدود ملوکیت** - یہ بنو امیہؓ کی ملوکیت کے ایام تھے۔ لیکن اس ملوکیت کو دیگر اقوام کی ملوکیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست کا سربراہ بادشاہ ہوتا تھا اور تلوار کی نوک سے بیعت لیتا تھا۔ تاہم ملوکیت کا تصور اُس وقت بھی اس قدر قابلِ نفرین تھا کہ بادشاہ بجائے بادشاہ کہلانے کے خلیفہ اور امیر المومنین کہلوانا پسند کرتے تھے۔ اس نام کی لاج رکھنے کے لئے وہ حتیٰ الامکان کوشاں رہتے تھے۔

ملوکیت کے شخصی لوازم سے قطعِ نظر مملکت میں اسلامی قوانین رائج تھے معاشرہ کا محبوب رنگ اسلامی رنگ تھا۔ یہ دَور اسلامی اصول و قوانین کی پیروی میں خلافتِ راشدہ کو تو نہیں پہنچتا لیکن بعد کے سب ادوار سے افضل تھا۔ عوام کے دلوں میں قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہ کی جو قدر و منزلت تھی اس میں خلوص موجزن تھا۔ اسی کا اثر تھا کہ ملوکیت کے خلاف آئے دن تلواریں بے نیام ہو جاتی تھیں۔

ملوکیت اس دور کی ایک خامی ضرور تھی لیکن اس کے سوا دین وقانون اسلامی تھا۔ تاریخ سے غافل لوگ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے سبب سے اسلامی نظامِ حیات قائم نہ رہ سکا۔

اس دور میں علمِ فقہ اس سرکاری شفقت سے محروم ہو گیا جو اسے خلافتِ راشدہ میں حاصل تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے ضعف

پہنچا۔ اس کی خدمت اور پاسبانی میں علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے وہ جانی اور مالی ایثار کیے جو رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ یہ ایثار رائیگاں نہیں گیے۔

(۲) نئے مسائل۔ اسلامی حکومت کی حدود سندھ، ترکستان، شمالی افریقہ اور سپین سے بھی آگے نکل گئیں۔ نئے نئے مسائل ابھرے اور فقہ کے کنارے پھیل گئے۔

(۳) علمی کاوشیں۔ جگہ جگہ علمی مرکز قائم ہوئے اور تحصیل علم کی سرگرمیاں بڑھیں۔ علماء نے ایک ایک حدیث کی تلاش میں بڑی بڑی مشقتیں اٹھائیں۔

حدیث کے روز افزوں علم کے پہلو بہ پہلو غلط اور موضوع روایات کا فتنہ پیدا ہوا۔ اس کی روک تھام کے لئے علمائے حدیث نے قبولِ روایت میں سخت روش اختیار کی۔ اسناد کی چھان بین نہایت دیدہ ریزی اور جان فشانی سے ہونے لگی۔

(۴) فقہ کی سادگی۔ فقہ نہایت سادہ ہیئت میں تھا۔ اہل السنت والجماعت کا کوئی گروہ فلسفہ و کلام کے قریب نہیں جاتا تھا۔

(۵) ابتدائی تدوین۔ فقہی اصطلاحات مثلاً واجب، سنت، مستحب وغیرہ رائج ہوئیں۔ فقہ کے اصول اور ابواب کی سادہ شکل قائم ہوئی لیکن مفصل قواعد ابھی تک مرتب نہیں ہوئے تھے۔

(۶) کتب فقہ کا آغاز۔ تصنیف و تالیف کی ابتداء ہوئی۔ ابن جُریجؒ، ابن عُیینہؒ اور امام ثوریؒ وغیرہ نے کتابیں لکھیں جو اب ناپید ہیں۔

(۷) اجماع کی عملی تشکیل۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب مدینہ کے والی ہوئے تو انہوں نے اجماع کی عملی تشکیل کی ایک قابلِ تحسین کوشش کی۔ انہوں نے

سات فقہا کی ایک مجلس قائم کی جنہیں فُقہائے سَبعہ کہتے ہیں۔ یہ اصحاب مشترکہ غَور و خوض کے بعد فتویٰ صادر کیا کرتے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث (وفات ۔ ۹۴ھ)

(۲) خارجہ بن زید بن ثابت (وفات ۔ ۹۹ھ)

(۳) قاسم بن محمد (وفات ۔ ۱۰۹ھ)

(۴) سعید بن مُسیّب (وفات ۔ ۱۰۱ھ)

(۵) عبداللہ بن عُتبہ (وفات ۔ ۱۰۲ھ)

(۶) عُروہ بن زُبیر (وفات ۔ ۱۰۶ھ)

(۷) سُلیمان بن یَسار (وفات ۔ ۱۰۷ھ)[1]

(۸) **مقامی اِجماع** ۔ اِجماع کے سب علماء قائل تھے۔ لیکن ملکی وسعت کی وجہ سے ایک عالمگیر اجماع مُشکل تھا۔ اس لئے اِجماع میں علاقائی رنگ بھی پیدا ہونے لگا۔ ہر علاقہ اور ہر شہر کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ اس لئے علاقائی یا مقامی اجماع کے بغیر چارہ نہ تھا۔

(۹) **مقامی فتاوٰی** ۔ مرکزی شہروں میں صحابہ اور تابعین سکونت پذیر تھے۔ ہر شہر میں ان اکابر میں سے کوئی نہ کوئی مستند عالم فقہ کا امام ہوتا تھا۔ شہر کے لوگ اسی کے فتاوٰی کی پابندی کرتے تھے کیونکہ حدیث و فقہ کی ملک گیر تدوین نہیں ہوئی تھی۔

فتووں کی مقامیت ایک وقتی مجبوری تھی جو تعصب سے بہت بلند تھی۔ حضرت عمر ثانیؒ جب مدینہ میں تھے تو مقدمہ کا فیصلہ مدّعی کی قسم اور گواہ پر کرتے تھے۔ یہاں سے شام گیے تو دو عادل گواہوں یا ایک عادل گواہ اور

---

[1] زوادی

دو عورتوں کی گواہی طلب کرتے تھے - ایک شخص نے اس بارہ میں آپ سے استفسار کیا تو جواب میں لکھا کہ مدینہ میں جس چیز پر عمل تھا ہم نے اس کی پیروی کی - شام آئے تو شامیوں کے بموجب فیصلہ کیا [۱]

(۱۰) نئے فرقے ـــ بعض نئے فرقوں نے زور پکڑا - انہوں نے الگ الگ اصول اور نظریات پیش کیے اور ان کی بنا پر اپنے اپنے فقہی مکاتب کی تشکیل کی -

(۱۱) اہل الحدیث اور اہل الرائے ـــ اہل السنت والجماعت کے فقہا میں ایک نظریاتی فرق رونما ہوا جو دور رس نہ تھا لیکن قابلِ توجہ ضرور ہے - اس فرق کی بنیاد یہ تھی کہ بعض علماء فتوٰی صادر کرنے میں ازبس محتاط تھے - قرآن و حدیث اور سلف سے مسئلہ کا کوئی تیار جواب مل جاتا تو بہتر، ورنہ حتی الوسع فتوٰی سے اجتناب کرتے تھے - کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی عالم سے فتوٰی پوچھا جاتا، وہ اپنے ساتھی سے کہتا کہ آپ جواب دیں - وہ اگلے پر ٹال دیتا، حتی کہ مسئلہ گھوم کر پہلے عالم کے پاس آجاتا - یہ گروہ اہل الحدیث کہلاتا تھا -

دوسرے فریق کا دعوٰی تھا کہ فقہ دین کی روح ہے - یہ علماء افتاء سے کترانا، ایک دینی فریضہ سے پہلو تہی کرنے کے مترادف سمجھتے تھے - نتیجہ یہ کہ ان کے ہاں اجتہاد کا دامن فراخ تھا - اجتہاد کے لئے اُس وقت عام لفظ رائے تھا - اس لئے یہ لوگ اہل الرائے کہلانے لگے -

اہل الحدیث اور اہل الرائے میں فرق اجتہاد کی کمی بیشی کا تھا - ناموں کے فرق کا مطلب یہ نہیں کہ اہلِ حدیث صرف حدیث کے قائل تھے اور اہلِ رائے صرف رائے کے -

اس دور کے اہل الرائے میں ربیعہ سرفہرست تھے اور ربیعۃ الرائے

---

[۱] الانتقاء - ص ۳۳

یعنی بڑے اجتہاد والے ربیعہ کہلاتے تھے۔

اجتماعی رُوح کی تڑپ، فتاویٰ کی ہمہ دم بڑھتی ہوئی بہتات اور ملک گیر مسائل اس بات کے متقاضی تھے کہ منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی ہو۔ ایک ملّت گیر نظامِ فکر کا ظہور ہو اور علمِ فقہ کی تدوین کی جائے۔ یہ ایک عبوری دَور تھا جس کی فضاء میں آنے والے ایک روشن و تابناک اور فکر انگیز، و حکمت آفریں عہد کے عناصر پل رہے ہیں۔

چوتھا دور

دوسری صدی کی ابتداء سے چوتھی صدی کے نصف تک

اس دور میں علمی حرکت انتہا کو پہنچی۔ نہ صرف شرعی علوم بلکہ دنیوی فنون نے بھی عروج حاصل کیا۔ بنو عباس علم کے پُر جوش سرپرست تھے۔ انہوں نے فلسفہ، سائنس، ریاضیات، فلکیات، طب وغیرہ متعدد علوم کی ترویج و ترقی کی سعی کی۔ دارالسلطنت بغداد میں ایک بیتُ الحکمت (حکمت کدہ) قائم ہوا جس میں علمی کُتب کے ترجمہ کرنے کا کام ہوتا تھا۔ ان علوم میں سے بالخصوص فلسفہ اور علم الکلام اسلامی فقہ کو بھی متأثر کرنے کے درپے ہو گئے۔

علمائے دین کا گروہ کتاب و سنّت کا مُتّبع تھا۔ ان میں فرعی اختلافات تھے، لیکن فکری انتشار نہ تھا۔ علمائے دین ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ جب کلیات میں اتحاد ہوتا تو دوسرے عالم کے فرعی اختلافات کو جائز اور صحیح مانتے تھے۔ ابتداءً ان کے ہاں فلسفہ و کلام کی حُجّت آرائیاں یکساں طور پر مکروہ تھیں۔

مِلّی ضروریات اور علمی تحریکات نے محدّثین اور فقہاء کے کندھوں پر ایک عظیم ذمّہ داری ڈال دی۔ انہوں نے شبانہ روز کی عرق ریزی کے بعد اسلامی علوم کی تشکیل و ترتیب کا کارنامہ انجام دیا۔ حدیث کی تدوین ہوئی۔ فقہی نظاماتِ فکر نے تکمیل کے

مرحلے طے کئے اور قانون کا گراں قدر دفتر منصۂ شہود پر آیا۔

احادیث پہلے ملک گیر پیمانہ پر جمع نہ تھیں۔ علماء نے شہر شہر سے انہیں اکٹھا کر کے یک جا کیا۔ مشکوک اور موضوع حدیثوں کو الگ کیا۔ صحیح حدیثوں کو فقہی ابواب میں مرتب کیا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ بھی احادیث کے کئی مستند مجموعے تیار ہوئے۔ حدیث کی تحقیق اور تدریس کے سلسلہ میں کئی علوم وجود میں آئے۔ حدیث کا فن اس قدر وسیع ہوا کہ ایک عالم کے لئے مشکل ہو گیا کہ بہ یک وقت حدیث کی سب جزئیات پر حاوی ہو اور قانونی کاوشیں بھی انجام دے۔ اس لئے علماء کے دو گروہ ہو گئے یعنی محدثین اور فقہاء۔ اگرچہ بلند پایہ علماء محدّث بھی ہوتے تھے اور فقیہ بھی لیکن حق یہ ہے کہ ان کے ہاں بھی فنِ حدیث یا فقہ میں سے کسی ایک علم کا پلّہ دوسرے پر بھاری ہوتا تھا۔ جس عالم کو حدیث پر دسترس زیادہ ہوتی وہ محدّث کہلاتا تھا اور جس کا فقہ پر اقتدار زیادہ ہوتا اسے فقیہ یا مجتہد کہتے تھے۔ فقہاء میں بھی جیسا کہ تیسرے دور کے ذکر میں ہم بتا آئے ہیں دو گروہ تھے: اہل الحدیث اور اہل الرّائے۔ ان گروہوں میں اہم فرق فتاوٰی کی کمی بیشی کا تھا۔ اہل السنت والجماعت کے علماء میں سے چاہے کوئی محدّث تھا یا فقیہہ، اہل الحدیث تھا یا اہل الرّائے، سب حدیث کے پابند تھے۔ ان کے درمیان تعبیرات کے اختلاف نے فرعی اختلافات پیدا کر دیے تھے جن کی بناء پر فقہی مذاہب اٹھے لیکن بقولِ امام مالکؒ ان فرعی اختلافات کے باوصف ہر مذہب حق پر تھا۔

اصولِ چہارگانہ پر بے شک شروع سے عمل تھا لیکن اب انہیں باقاعدہ فنی صورت میں مرتب کیا گیا۔ فقہ کا دامن پھیلا تو زیادہ دقیقہ رسی اور قواعد سازی کی ضرورت پیش آئی۔ ان اصول پر تحریریں لکھی گئیں جن میں

خوب بحث وتمحیص ہوئی۔ سب سے پہلے واصل بن عطاء نے اصولِ چہارگانہ پر قلم اٹھایا۔ یہ ایک ابتدائی کوشش تھی۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان میں مزید غور وخوض کیا۔ آپ نے اس فن میں کوئی تالیف سپردِ قلم نہیں کی لیکن اسے ایک ضابطہ کی صورت دینے میں بہت اہم حصہ لیا۔ درایت اور قیاس کے اصول کو کمال تک پہنچایا۔ چنانچہ بعض لوگ تو آپ کو قیاس کا بانی کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ قیاس کا لفظ سب سے پہلے حضرت فاروق اعظمؓ نے استعمال کیا ہے اور اس کا بنیادی قاعدہ بھی بتایا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اصول پر تصنیفات لکھیں لیکن وہ ناپید ہوگئیں۔ پھر امام شافعی آئے۔ انہوں نے اس موضوع پر طویل کتابیں قلم بند کیں اور فقیہانہ بالغ نظری کی اَنمٹ یادگار چھوڑ گئے۔ ان کے بعد فقہی اصول کی کتابوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔

چہارگانہ مآخذ کے ذیل میں استحسان اور استصلاح وغیرہ کے اصول بھی صورت پذیر ہوئے۔ اور اس امر پر بھی خوب بحثیں چلیں کہ شریعت میں اسرار و مصالح کا وجود ہے یا نہیں اور اگر ہے تو ہم کس حد تک ان سے اصول مستنبط کرکے ان کی روشنی میں قانون سازی کر سکتے ہیں۔ ایک اور اہم بحث تقدیری یعنی فرضی مسائل کی تھی کہ آیا ان پر غور وخوض ہو سکتا ہے یا نہیں۔
امام ابوحنیفہؒ جو اہل الرّائے کے سرگروہ ہیں شریعت کے اسرار ومصالح اور ان سے اصول مستنبط کرنے کے حامی تھے۔ آپ فرضی مسائل کے بھی حق میں تھے۔ اہل الحدیث علماء کو ان امور میں حضرت ابوحنیفہؒ سے اختلاف تھا۔

سابقہ دور میں کچھ فقہی اصطلاحات پیدا ہوئی تھیں، اب ان کی تعداد اور بڑھی۔ اساتذۂ فقہ نے تدریس کے لئے مکتب قائم کیے جن میں

دور و نزدیک سے ہزاروں طلبہ شریک ہوتے تھے۔

اس دور میں الگ الگ فقہی دبستان قائم ہوئے۔ اور کئی مذاہب نے جنم لیا، مثلاً: مالکیہ، حنفیہ، شافعیہ، حنبلیہ، ظاہریہ، جریریہ وغیرہ۔ ان میں سے کچھ مذاہب زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور اہلُ السنّت والجماعت میں فقط چار نمایاں مذاہب یعنی مالکیہ، حنفیہ، شافعیہ اور حنبلیہ باقی رہے۔ ان کو مذاہبِ اربعہ کہا جاتا ہے۔ ان کے ماسوا شیعی مکتبِ فکر کی بھی ایک کثیر آبادی پیرو تھی۔

مذہب مالکی کے بانی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ) ہیں۔ آپ کے نزدیک اسلام کے فقہی مسائل کے صحیح خطوط وہی ہیں جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ کے باشندوں میں عملاً یا لفظاً متوارث چلے آئے ہیں۔ مدینہ کی زندگی سادہ تھی۔ نئے مسائل کم درپیش تھے۔ اس لئے رائے کے استعمال کی زیادہ حاجت نہ تھی۔

مالکیہ کے دوش بدوش عراق میں ایک اور مسلک کی بنیاد پڑی جسے اس کے بانی حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ) کے نام سے حنفی مذہب کہتے ہیں۔ علاقہ کی نسبت سے اسے عراقی بھی کہا جاتا ہے۔ عراق کو اسلامی سیاست میں بہت اہمیّت حاصل تھی۔ یہ سرزمین ہنگاموں کا گہوارہ تھی۔ آئے دن نئی نئی معاشرتی اور انتظامی مہمّات سر اٹھاتی تھیں۔ اس لئے فقہ کو ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے کناروں کو پھیلانا پڑا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رح کو اللہ تعالیٰ نے توانا ذہن، بے کنار علم، سریع فہم اور وسیع نظر عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے ہر نو پیدا مسئلہ کو گرفت میں لیا۔ اور کتاب وسنّت، اجماعِ صحابہ اور ذاتی طبّاعی کی مدد سے اس کا حل ڈھونڈ نکالا۔ مسائل کی کثرت کی وجہ

سے جناب امام کو رائے (اجتہاد) سے زیادہ کام لینا ناگزیر تھا اس لئے اہل الرائے کے سرخیل شمار ہوئے۔ آپ نے نہ صرف کتاب و سُنّت کے اَحکام اور سَلَف کی نظائر کو سامنے رکھا بلکہ شریعت کے کچھ اصول بھی مُستنبط کئے تاکہ جہاں قیاس مدد نہ دے سکے وہاں ان اصول سے مدد لی جائے۔

جس سال امام ابو حنیفہؒ اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے اسی سال ایک اور اور سراپا فطانت ہستی عالمِ شہود میں آئی۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) تھے۔ آپ امام مالک کے شاگرد تھے۔ آپ نے عراقی طرزِ فکر کا مطالعہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد سے کیا۔ ان دونوں مذہبوں میں غور کرنے کے بعد ایک نئے مکتبِ فقہ کی بِنا ڈالی جسے شافعیّت کہتے ہیں۔ آپ لُغت کے امام بھی تھے اور قوتِ استدلال میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے نظریات میں حیرت انگیز قوت اور توازُن ہے۔ امام شافعی کے بعد ان کے شاگردِ رشید حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) نے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی۔ آپ علمِ حدیث کے بحرِ زخّار تھے۔ آپ نے حدیث اور اقوالِ سَلَف پر زیادہ توجہ دی۔ یہ آپ کے مذہب کا نشانِ امتیاز ہے۔ آپ فقیہانہ صلاحیتوں سے بھی مالامال تھے۔ آپ کے مسلک میں نمُوّ اور وسعت پذیری کے عناصر کی کمی نہیں۔

اَئمّہ اربعہ کو ایک دوسرے سے تلمّذ اور استفادہ کا شرف حاصل تھا۔ ان کے مذاہب کسی بنیادی تفریق کا مظہر نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ اکثر مسائل کی اصل مشروعیت میں اَئمہ کا اختلاف نہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ جب ایک سے زائد امر پر فتویٰ کا احتمال ہوتا تو یہ دیکھتے کہ ان میں اَولیٰ یعنی بہتر کون سا ہے ...... علمائے کِرام اجتہادی مسائل میں (سب) مفتیوں کے فتاویٰ کو جائز مانتے رہے ہیں اور (سب) قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم

کرتے رہے ہیں اور بعض اوقات اپنے مذاہب کے خلاف (کسی دوسرے مذہب کے موافق) عمل کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا تم دیکھو گے کہ جب ائمۂ مذاہب اپنے قول کو صحیح قرار دیتے تھے تو مخالف قول کا ثبوت بھی تسلیم کرتے تھے اور اپنے قول کے بارہ میں کہتے تھے کہ اس میں احتیاط زیادہ ہے۔ میں اسے اختیار کرتا ہوں۔ یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ ہم تک یہی قول پہنچا ہے۔ وغیرہ ....

ائمہ اختلافِ مسائل کے باوصف ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ امام شافعیؒ نے صبح کی نماز امام ابو حنیفہؒ کے مزار کے پاس ادا کی اور ان کے ادب کے لحاظ سے ان کے فتوٰی کے مطابق پڑھی۔ ان کا قول ہے کہ ہم بارہا حنفیہ کے مذہب کی طرف رخ کرتے ہیں[1]۔

مذاہبِ اربعہ کا مفصّل ذکر ہم آئندہ باب میں علیحدہ کریں گے۔ شروع میں ان مذاہب کی تقلید عوام کو لازم نہ تھی۔ ائمہ تقلید کے خلاف تھے[2]۔

امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے کہ ہمارے فتوٰی سے بہتر فتوٰی ملے، تو اُسے اختیار کرو[3]۔ امام شافعی کا قول ہے کہ لوگ مجھ سے علم سیکھیں لیکن مجھ سے منسوب نہ کریں[4]۔ امام احمد بن حنبلؒ اپنے فتوے قلمبند نہیں کرنے دیتے تھے[5]۔ ایک شخص سے کہا کہ نہ میری تقلید کرنا اور نہ مالک، اوزاعی اور نخعی وغیرہ کی[6]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ واوین میں الفاظ مؤلفِ ہذا کے ہیں۔

[2] اعلام الموقعین۔ حجۃ اللہ البالغہ۔

[3] رسالہ انصاف۔

[4] البدایہ والنہایہ۔

[5] اعلام الموقعین۔

[6] حجۃ اللہ البالغہ۔

ان اقوال سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں :

اوّل :۔ عوام جس امام یا عالم سے چاہتے فتویٰ لے سکتے ہیں۔

دوم :۔ اصحاب اجتہاد کو کسی امام کی اندھا دھند تقلید جائز نہ تھی۔ یہ اس لئے کہ اجتہاد بڑھتا رہے۔ اس کی تائید امام ابو حنیفہؒ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ کسی کو جائز نہیں کہ میری دلیل کو سمجھے بغیر میرے قول کے مطابق فتویٰ دے[1] امام ابو یوسف اور ان جیسے مستند فقہا کا قول ہے کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے فتویٰ کا ماخذ کیا ہے اس وقت تک کوئی شخص ہمارے قول کے مطابق فتویٰ نہ دے[2]

اس دور میں مجتہدین کی کثرت نظر آتی ہے۔ لیکن اہل السنّت والجماعت کے مجتہدین ائمہؒ اربعہ میں سے کسی ایک امام سے منتسب ہو کر رہتے تھے کیونکہ کسی الگ فقہی مسلک کا بانی وہی ہو سکتا ہے جو استنباط کے اصول و قواعد میں ترمیم و تبدیل کر سکے۔

مجتہد کو مذہب معیّنہ کے اندر رہ کر بھی اختلاف رائے کا حق تھا۔ ہر مذہب کے اندر مجتہدین کے جزوی مسائل میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو عقلوں پر تالے پڑ جائیں اور ذہن شل ہو کر رہ جائیں۔ اس دور میں فتووں کا ایک بیش قدر انبار لگ گیا۔ یہ سرمایہ قاعدہ و قانون اور فکری نظم و ضبط کا ایک ایسا قابل رشک کرشمہ پیش کرتا ہے کہ بعض اوقات اغیار کہہ اٹھتے ہیں کہ اس متاع کو مسلمانوں نے رومادالوں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

[2] حجۃ اللہ البالغہ

سے مستعار لیا ہے۔ یہ دعویٰ غلط ہی نہیں بے بنیاد بھی ہے۔ بے شک علم کسی کی میراث نہیں۔ دوسروں کی خوبی کو اپنا لینا عیب نہیں ہنر ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی فقہ کا تعلق ہے یہ کسی غیر قوم کا مرہون نہیں۔ روما کے علوم کی متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں اور اہلِ اسلام نے ان سے استفادہ کیا لیکن تاریخ قانون کی ایک کتاب کا بھی نام نہیں بتاتی جس کا ترجمہ ہوا ہو یا اس سے استفادہ کیا گیا ہو۔

پانچواں دَور — چوتھی صدی کے نصف دوم سے زوالِ بغداد تک

یہ دَور چھٹی صدی ہجری کے نصف پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں تقلید مستحکم ہو گئی۔ علمائے کرام نے فیصلہ کیا کہ ہر شخص کسی نہ کسی امام کی پابندی کرے۔ اس وابستگی اور انضباط کا یہ فائدہ تھا کہ مُقلّد ایک فکری نظام کے تحت رہ کر ذہنی اور عملی بدنظمی سے بچ سکتا تھا[۱]۔ علم کی کمی ہو گئی تھی لہٰذا نام نہاد اور ہوا پرست علماء کے جال سے بچنے کا کامیاب طریقہ یہی تھا کہ اَئمۂ اربعہ سے وابستگی رہے۔ دنیا کے سب فنون میں مُسَلَّمُ الثبوت ماہرین کو سند کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ البتہ یہ احتیاط ضروری ہے کہ ان کے کمال پر بھروسا کر کے آئندہ ترقی کا باب بند نہ کر دیا جائے۔ صحابۂ کرامؓ کے عہد میں بھی ہر شخص فتوٰی دینے کا مجاز نہ تھا۔ صرف مستند صحابہؓ کا فتوٰی مقبول ہوتا تھا۔

جس دور کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس کو مابعد کے ادوار سے یہ امتیاز

---

[۱] ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تقلید محض کو ایک تَلَعُّب کی حِیَل بندی بتایا ہے۔

حاصل ہے کہ تقلید کے ساتھ ساتھ اجتہاد بھی عروج پر تھا۔ اس اثناء میں کئی نامور فقہاء پیدا ہوئے لیکن ان کی گردنیں ائمۂ کبار کی عظمت و جلال کے آگے اٹھ نہ سکیں۔ انہیں ہم اس دور کے درجۂ اوّل کے مجتہدین شمار کرتے ہیں۔ اصطلاح میں انہیں مجتہدِ مطلق منتسب کہتے ہیں۔

دوسرے درجہ کے مجتہدین نے صرف یہی کام سنبھالا کہ آئمہ کے مسائل رٹ لئے اور ان کو سامنے رکھ کر کچھ اصول بھی مستنبط کئے۔ کوئی نیا مسئلہ آتا تو امام کے کسی قول سے یا اس کے اقوال سے مُستَنبَط شدہ اصول یا اس کی طرزِ زندگی کی روشنی میں فتوی دیتے تھے۔ اسے تخریج کہتے ہیں۔ اصطلاح میں ان علماء کو مجتہد فی المذہب یا اصحابِ تخریج کہا جاتا ہے۔

اس دور میں چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ بعض اصول پر تھیں اور بعض فتاوی کے مجموعے تھے۔ حنفی فقہ میں اصولِ بَزدوی، مختصرِ قدوری سَرخسی کی مبسوط، قاضی خان کے فتاوی اور مَرغِینانی کی ہدایہ بہت مشہور ہیں۔

ان ایام میں مناظرات کی بنا پڑی۔ ابتداء میں مناظروں کا مقصود محض مبادلۂ خیالات تھا۔ مختلف مذاہب کے عُلماء آپس میں مل کر تحقیقِ حق کے لئے مباحثے کرتے تھے۔ مناظرات کے لئے آداب وضع ہوئے اور ان پر کتابیں لکھی گئیں۔

معتزلہ نے جس علمِ کلام کی بنا رکھی تھی ائمۂ مذاہب نے اس کو مدارِ مذہب نہیں بنایا لیکن ان کے پیروؤں نے طالب علموں کا ذہن تیز کرنے کے لئے اسے قبول کر لیا۔ چندے تو مناظرات مفیدِ مطلب رہے لیکن آہستہ آہستہ ان میں تعصب اور جَدَل کی زہر سرایت کرتی گئی۔

چھٹا دور ــــ زوالِ بغداد کے بعد

یہ دور تقلیدِ محض کا ہے جس میں اجتہاد کی رفتار گھسٹ گئی - پانچویں دور میں جو کتابیں لکھی گئیں اب ان کی تدریس پر اکتفا ہوا - بہت ہوا تو کسی نے ان کا اختصار کیا یا حاشیہ لکھ دیا -

اس دور میں بلند نام علماء خال خال نظر آتے ہیں - ابنِ تیمیہ، سبکی، ابن القیم، بُلقینی اور جلال الدین سیوطی اس دور کی گنی چُنی ہستیوں میں سے تھے -

مناظرات نے ہوا باندھی - ان پر تعصب اور کٹھ حجتی کا تسلط ہو گیا - حق کی تلاش کم تھی اور مخالفین سے زور آزمائی کا جذبہ زیادہ - اس جدل و خلاف نے فتنہ کی صورت اختیار کر لی - ان جھگڑوں کی سربراہی نیم ملاؤں یا نمائشی عالموں کے ہاتھ میں تھی کیونکہ اب اکثریت انہی کی ہو رہی تھی - یہ جھگڑے درحقیقت ذاتی میلانات اور گروہ بندی کی پیداوار ہوتے تھے لیکن اپنے محاذ پر حلہ آشیاں ائمہ کو لا کھڑا کرتے تھے - ان کا اسلحہ خانہ بھی ائمہ سابقہ کے فقہی ذخائر تھے - یہ لوگ بھول بیٹھے کہ ہماری حرکات ائمہ کرام کی منشاء اور روش کے خلاف ہیں اور سطحی نگاہ رکھنے والوں میں یہ غلط فہمی پیدا کر رہی ہیں کہ اسلامی فقہ ہی ان ہنگاموں کی جڑ ہے - اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ موجودہ عہد میں رواداری پیدا ہو رہی ہے - اور یہ بے بنیاد جدلیات پارینہ حکایات ہو رہی ہیں ؛

بابِ چہارم

مَذاہبِ اَربَعہ

امام ابو حنیفہؒ

حالاتِ زندگی

آپ ۸۰ ہجری میں کوفہ کے شہر میں ایک عجمی تاجر ثابت بن زُوطَے کے ہاں پیدا ہوئے۔ نام نعمان تھا مگر نام سے زیادہ کُنیَت ابو حنیفہ اور لقب امامِ اعظم نے شہرت پائی۔ آپ تابعی تھے[1]

آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو باپ دادا کا پیشہ یعنی کپڑے کی تجارت اختیار کی جو آپ کی فہم و فراست اور دیانت داری کے بدولت نہایت کامیاب ہوئی۔ ان ایّام میں کوفہ میں علومِ نقلی و عقلی کی گرم بازاری تھی۔ آپ کی طبیعت میں بھی تحصیلِ علم کی رغبت پیدا ہوئی۔ اس اثناء میں ایک دن آپ کی مُلاقات وقت کے بے عدیل امام حضرت شعبی سے ہو گئی۔ انہوں نے آپ کی پیشانی میں سَعادَت، بیدار طبعی اور جُستجو کی چمک دیکھی تو تحصیلِ علم اور صُحبتِ عُلماء کا مزید شوق دلایا۔ آپ تجارت سے یکسو ہو کر علم میں کھو گئے[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۔ [2] مناقبُ الامام الاعظم از موفق۔

آپ نے امام حمادؒ بن سلمہ کا تلمذ اختیار کیا۔ وہ ان دنوں کوفہ میں فقہ کا مرجع تھے۔ آپ نے امام حماد کے علاوہ اور بھی کئی اصحاب علم سے فقہ اور حدیث کی تحصیل کی۔ اس دوران میں حرمین کے بھی سفر کئے۔ وہاں بعض چیدہ علماء سے ملے۔ اور ان سے مستفیض ہوئے۔ آپ نے چار ہزار شیوخِ علم سے فیض اٹھایا ہے[1]

آپ نے جلد ہی فقہ میں ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا اور عقیدت کی نگاہیں آپ پر جم گئیں۔ لیکن جب تک امام حمادؒ زندہ رہے ان کے ادب سے علیحدہ درس قائم نہ کیا۔ ۱۲۰ ہجری میں امام حماد نے انتقال فرمایا۔ لوگوں نے ان کی مسند آپ کو سونپ دی[2] روحانی اور علمی جلالت نے آپ کو دنیائے اسلام کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ حاسدوں نے شروع میں آپ کے خلاف بدظنی پھیلانا چاہی لیکن تھک کر بیٹھ گئے۔

ان دنوں حضرت امام حسینؓ کے پوتے امام محمد باقرؒ کا آفتابِ علم و کمال نصفُ النہار پر تھا۔ ان کے کان بھی غلط کوشوں نے بھرے کہ امام ابوحنیفہؒ حدیث پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن جب امام ابوحنیفہ نے خود ان کے آستانۂ قدس پر حاضری دی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تو امام محمد باقر نے اُٹھ کر آپ کو سینے لگایا اور چُوم لیا۔

ملوکیت بعض اوقات حق پرست اور بے نیاز نفوس کے لئے مصائب اور ابتلاؤں کے ٹھٹ لگا دیتی ہے۔ اُموی حکومت نے آپ کو سرکاری ملازمت پر مجبور کرنا چاہا لیکن آپ نے تسلیم نہ کیا۔ شاہی نازک مزاجی کو آپ کا انکار کیسے گوارا ہو سکتا تھا؟ آپ کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ لیکن آپ کے قدم نہ ڈگمگائے[3]

---

[1] مقدمہ جامع المسانید [2] تبیض الصحیفہ از سیوطی [3] البدایہ والنہایہ۔ الانتقاء

بنوامیہ کا تخت آلِ عباس نے سنبھالا۔ منصور خلیفہ ہوا تو سادات کے ایک امام محمد نفس زکیہ[رح] اس کے خلاف اُٹھے۔ امام ابوحنیفہ[رح] نے ان کے حق میں فتویٰ دیا[۱]۔ منصور فتح یاب ہوا تو اس نے ۱۴۶ ہجری میں امامِ اعظم[رح] کو کوفہ سے بغداد بُلایا[۲] اور قضاوت کا عہدہ پیش کیا۔ آپ نے انکار فرمایا اور کہا مجھ میں اس کی اہلیت نہیں۔ منصور نے بھڑک کر کہا، تم جھوٹے ہو۔ فرمایا، پھر تو میں اور بھی اس عہدہ کے قابل نہیں کیونکہ آپ نے مجھے جھوٹا کہا ہے۔ اور جھوٹا قضا کے قابل نہیں ہوتا۔ منصور نے سو کوڑے پٹوائے اور قید میں ڈلوادیا[۳]۔ یہاں سے ۴ برس کے بعد جب چھوٹے کہ رُوح نے قفسِ عنصری سے رہائی پائی۔

پردیس کے اس عالم میں بھی قبولِ عام کا یہ نقشہ نظر آیا کہ پہلے روز پچاس ہزار سے زائد اشخاص جنازہ میں آئے۔ جنازہ کی نماز چھ بار پڑھی گئی۔ بعد میں بھی عقیدت مند آتے رہے اور مزار پر بیس روز تک نمازِ جنازہ ادا ہوتی رہی[۴]۔ بغداد کے جس محلہ میں آپ کا مزار ہے اعظمیہ کہلاتا ہے۔

اوصاف و خصائل

قسّامِ ازل نے امامِ اعظم میں فقاہت کے سب عناصر بدرجۂ کمال ودیعت کئے تھے۔ آپ عجم نژاد تھے لیکن کوفہ میں پرورش پائی تھی جہاں کی بولی عربی تھی۔ اس لئے آپ کو بھی اس مقدس زبان کی گود نصیب ہوئی۔ ذہنی استعداد اور اَن تھک مشقت سے قادر الفن عربی دان ہو گئے۔ حدیث کا وسیع سرمایہ فراہم کیا۔ معاملہ رسی، زود فہمی، اور نکتہ پروری کے اوصاف جو فقہ کی جان ہیں آپ کا مایۂ خمیر تھے۔ آپ کی طبّاعی اور دقّتِ نظر کا جواب تاریخِ عالم میں خال خال نظر آتا ہے۔ امام مالک[رح] نے ایک دفعہ

---

[۱] تاریخ بغداد [۲] طبقات شعرانی [۳] جامع المسانید۔ تاریخ بغداد۔ [۴] سیرت النعمان شبلی

آپ کے بارہ میں فرمایا کہ آپ چاہیں تو اس ستون کو طلائی ثابت کر سکتے ہیں[1]

آپ کو نہایت مشکل اور ناگہانی الجھنوں کا حل یوں سُوجھ جاتا تھا گویا پہلے سے آپ کے پاس تیار تھا۔ مثلاً:

ایک شخص کی بیوی سے لڑائی مچ گئی۔ اس نے قسم کھا لی کہ صبح تک نہ بولو گی تو طلاق پڑ جائے گی۔ بیوی بھی ڈٹ گئی۔ رات گئے خاوند کو فکر لگی کہ صبح ہوتے ہی بیوی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ روتا روتا امام صاحب کی خدمت میں پہنچا کہ کیا کروں؟ فرمایا ہمت رو۔ کچھ مشکل نہیں۔ جاؤ بیوی سے کہو، لوگ کہتے ہیں تمہارا باپ جُلاہا ہے۔ اس نے جا کر بیوی سے یہ الفاظ کہے تو وہ بے تحاشا پھوٹ پڑی کہ تم جُلاہے ہو، تمہارا باپ جُلاہا ہے[2] یوں بیوی کی ضد نے مات کھائی اور طلاق ٹل گئی۔

ایک دفعہ خارجی سردار ضحاک نے ایک دستہ کے ہمراہ آپ کو آن گھیرا اور قتل پر آمادہ ہوا کہ تم تحکیم[3] کے قائل کیوں ہو۔ امام نے کہا، پہلے میرے ساتھ مناظرہ کرو۔ بولا، بہتر۔ آپ نے فرمایا، فیصلہ کے لئے اپنے سرداروں ہی سے کسی کو ثالث مقرر کر دو۔ اس نے مان لیا۔ آپ نے کہا، اب تم نے خود ہی تحکیم قبول کر لی۔ ضحاک لاجواب رہ گیا[4]

---

[1] جواہر المضیئہ۔ سہم المصیب ابن جوزی۔

[2] الانتقاء ابن عبدالبر

[3] تحکیم کے معنی ہیں ثالث ٹھہرانا۔ خوارج کا عقیدہ تھا کہ اپنے قضیوں میں ثالث ٹھہرانا کفر ہے

[4] الانتقاء

ایک دفعہ چند خوارج تلواریں لہراتے آپ کے پاس آدھمکے اور بولے، تمہارا عقیدہ ہے کہ آدمی گناہ سے کافر نہیں ہوتا۔ یہ عقیدہ کفر ہے۔ اس سے توبہ کرو۔ فرمایا، میں ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں۔ بعد میں اُن کے سردار سے کسی نے کہا کہ ابوحنیفہ نے تو تمہارے کفر سے توبہ کی ہے۔ اُس سے پھر توبہ کراؤ۔ سردار نے دوبارہ توبہ کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا، کیا تم گمان سے یہ بات کہتے ہو یا یقین سے؟ سردار بولا' گمان سے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بعض گمان گناہ ہوتا ہے۔ لہٰذا تم خود توبہ کرو۔ سردار نے بھی توبہ کی[1]

آپ کا دل غیرُ اللہ سے بے خوف تھا۔ اللہ تعالیٰ سے لرزاں رہتے تھے۔ ایک دن ایک بچے کے پاؤں پر پاؤں آگیا۔ وُہ چلّایا' بڑے میاں! روزِ جزاء سے نہیں ڈرتے؟ آپ غش کھا گئے۔ ہوش میں آئے تو آپ سے پُوچھا گیا کہ ایک لڑکے کی آواز کا اتنا اثر بھی کیا لینا تھا۔ فرمایا' ڈرتا ہوں کہ یہی فہمائش نہ ہو[2]

آپ نہایت فراخ دل اور سخاوت شعار تھے۔ غریب طُلبہ کی اکثر دستگیری فرماتے تھے۔ ایک روز کسی کی عیادت کو جا رہے تھے سامنے سے ایک واقف کار نکلا۔ اُس نے چھُپ کر رستہ بدلنا چاہا مگر جب دیکھا کہ امام کی نظر پڑ گئی ہے تو رُک گیا۔ آپ نے پُوچھا' رستہ کیوں چھوڑ رہے جاتے تھے۔ اُس نے کہا، مجھ پر آپ کا دس ہزار درہم کا قرضہ ہے۔ مدت

---

[1] جامع المسانید باب اول۔

[2] جامع المسانید باب اول ص ۶۷۔

[3] کتاب الخیرات الحسان ابن حجر

چکی ہے اور ادا نہ کر سکا۔ شرم سے آنکھ برابر نہیں کر سکتا۔ آپ نے کل رقم معاف کر دی اور فرمایا "مجھے دیکھ کر تمہارے دل پر جو گزری اس کے بارہ میں مجھے معاف کر دو"[1]

دیانت داری کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ حاکمِ شہر نے آپ کو فتویٰ دینے سے روک دیا۔ ان ایام میں ایک دن آپ کی صاحبزادی نے پوچھا کہ میرے دانتوں سے خون نکلا ہے۔ کیا وضو کروں؟ فرمایا "بیٹی! مجھے فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہے اور مجھ سے قسم لی گئی ہے۔ اپنے بھائی حمّاد سے پوچھو"[2]

حلم و درگزر میں بھی آپ مرتبۂ کمال پر تھے۔ ایک دفعہ مکّہ کی ایک مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص منہ ڈھانپے آیا اور آپ کو فحش گالی دے کر کہا کہ تم نے فلاں مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا اور تم نے حَسَن بصری کی رائے کے خلاف فتویٰ دیا۔ آپ نے جواب دیا کہ حَسَن نے غلطی کی تھی۔ وہ شخص مزید بدزبانی کرنے لگا کہ تم حَسَن کو برسرِ غلط بتاتے ہو۔ آپ کے اصحاب اسے مارنے اُٹھے۔ آپ نے منع کیا اور گالیاں دینے والے سے فقط اتنا کہا کہ ہاں اس مسئلہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ درست اور حَسَن کا غلط ہے[3]

مُعاصرانہ چشمک رکھنے والوں اور حاسدوں کی کمی نہ تھی۔ آپ کے خلاف لوگ زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔ پر آپ کو کسی کی غیبت گوارا نہ تھی۔

---

[1] جامع المسانید [2] الانتقاد [3] جامع المسانید باب اول صفحہ ۶۹۔ تاریخ بغداد

امام اعظمؒ اور تدوین فقہ

فقہ کے مآخذ چہارگانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عہدِ مبارک سے چلے آتے ہیں ان کے بعد کسی فرد کو ان کا موجد قرار دینا غلط ہے۔ البتہ علمائے فقہ کا اس قدر حصّہ ضرور ہے کہ ان اصول میں مزید غور و فکر کر کے ان کے پیرایۂ تعبیر اور طریقِ استعمال کے قواعد اور شروط مرتب کیں اور فقہ کو ابواب میں تقسیم کیا۔ امام ابوحنیفہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ علمِ شریعت کو اس طور سے مدّون و مرتّب کرنے میں پیشوا ہیں[1]

آپ کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اہلُ السنّت والجماعت کے عُلماء میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مفروضہ مسائل کی طرف توجہ دی[2] مفروضہ مسائل پر غور کرنے کا یہی فائدہ نہیں کہ ذہنی چابک دستی اور فکری انضباط حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ عوام کو مستند فتوے تیار مل جاتے ہیں۔

آپ کا تیسرا امتیازِ عظیم یہ ہے کہ آپ نے حلِ مسائل کے لئے جماعت کی طرح ڈالی۔ اور اس طرح خلافتِ راشدہ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے شورائی تدبّر کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ آپ فقہی مسائل کو ایک ہزار اربابِ علم کے مجمع میں پیش کرتے تھے۔ ان میں چالیس صاحبُ الاجتہاد عُلماء تھے جو علم و ادراک کے آسمان کے آفتاب و مہتاب تھے۔ متفرق علم و فنون کے ماہرین اس بزم میں شامل ہوتے تھے۔ اور مسئلہ کا کوئی پہلو اوجھل نہیں رہتا تھا۔

اس مجلس میں کوئی امام ابویوسف کی طرح فقاہت اور روایت میں صاحبِ کمال تھا، کوئی امام محمد کے مانند زود فہم تھا اور زبان و فقہ کا نکتہ دان کوئی امام زُفر کی طرح علم اور ذہانت سے مالا مال تھا اور کوئی امام حسن بن زیاد

---

[1] جامع المسانید [2] جامع المسانید

کی طرح قانون دان تھا۔

لیل و نہار کی نگاہ سے فضیلت اور تقدس کی ایسی دل فریب کہکشاں اس دور کے بعد نہیں گزری۔ بعض مسئلوں پر ایک ایک مہینہ بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ جب کسی مسئلہ کا متفق فیصلہ ہو جاتا تو اسے لکھ لیا جاتا تھا۔[1] تدوینِ فقہ کا یہ اہتمام آپ کی زندگی کے اواخر تک رہا۔ لاکھوں مسئلے معرضِ تحریر میں آئے۔

اس طریق سے فقہ کا جو دفتر سپردِ قلم ہوا وہ آج دنیا سے ناپید ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کے نامور شاگردوں اور پیروکاروں نے اپنے طور سے نئے مجموعے قلمبند کئے۔ اُن میں اس دفتر کے تمام مسائل زیادہ وضاحت اور خوش ترتیبی سے آگئے۔ اصل نسخہ کی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے اس کا وجود آہستہ آہستہ اٹھ گیا۔

جو فقہ آج حنفی فقہ کے نام سے رائج ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کی کوئی قطعی تالیف پیش نہیں کرتا۔ بہر حال آپ کا علم حنفی فقہا کی تالیفات میں محفوظ رہ گیا ہے۔ آپ کے نام سے خوارزمی نے ایک مُسند جمع کی ہے جو مختلف اسناد کی چودہ مسندوں کا مجموعہ ہے۔ ان مسندوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی روایات بعد میں مدوّن کر دی گئیں۔[2]

امام ابوحنیفہ کے نام سے دو مزید رسالے اَلفِقہُ الاکبر اور اَلعالِمُ وَالمتعلّمُ بھی منسوب ہیں۔

امام اعظمؒ کے تلامذہ

امام اعظم کے شاگردوں کا شمار نہیں۔ ان میں متعدد ایسے تھے جو مسندِ امامت کے مالک ہوئے۔ آپ کے جو شاگرد حنفی فقہ کے ارکان کہلاتے ہیں چار ہیں:

---

[1] جامع المسانید [2] بستان المحدثین

امام ابو یوسف، محمد بن حسن، امام زُفر اور حسن بن زیاد لُولُوی۔ انہوں نے حنفی مسلک میں اجتہاد کا درجہ پیدا کیا ہے۔

یہ چار اصحاب امامِ اعظم کے پیرو ضرور تھے لیکن آپ کی اندھی تقلید نہیں کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے اُستاد حضرت حمّاد کی حنفی مسلک میں بہت وقعت ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے بار ہا ان سے اختلاف کیا ہے لیکن ان کے شاگردوں نے بعض دفعہ جناب حماد کی رائے کو امام ابو حنیفہ کی رائے پر ترجیح دی ہے۔ کئی نئے مسئلوں میں بھی انہوں نے امام ابو حنیفہ کے قول کو چھوڑا ہے[۱] ان اصحاب کا مختصر ذکر درج ذیل ہے:

(۱) امام ابو یوسفؒ

آپ کا نام یعقوب اور باپ کا نام ابراہیم تھا۔ ۱۱۵ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے۔ والدہ نے ایک دھوبی کے پاس کام سے لگایا۔ علم کا شوق جزوِ طبیعت تھا۔ کام چھوڑ کر امام اُبو حنیفہ کے درس میں آکر شریک ہو جاتے۔ والدہ پیچھے پیچھے آتیں اور ہاتھ سے پکڑ کر دھوبی کے پاس لے جاتیں۔ ایک دن تنگ آکر آپ کی والدہ نے امام صاحب سے کہا کہ یہ یتیم بچہ ہے۔ تم نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ میں اسے کہاں سے کھلاؤں[۲] امامِ اعظم کو اس حقیقت کا علم ہوا تو ان کی مدد اپنے ذمے لی۔

امام اعظم کے علاوہ آپ نے دیگر اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔ خلیفہ مہدی نے آپ کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور کیا۔ قبل ازیں اس عہدہ کا وجود نہ تھا۔ قاضی ابو یوسف دنیائے اسلام میں پہلے قاضی القضاۃ ہیں۔ ہارون الرشید کے عہد تک اس منصب پر فائز رہے۔[۳]

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ۲؎ البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ۳؎ البدایہ والنہایہ جلد ۱۰

قاضی صاحب نے دنیاوی لحاظ سے بھی بلند مقام پیدا کیا۔ مگر اس عروج نے آپ کی سادگی اور تواضع پر حرف نہ آنے دیا۔ شاگردوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بہت دولت ہاتھ آئی لیکن سب اللہ کی راہ میں صرف کر ڈالی۔

امام ابویوسفؒ ہارون الرشید ایسے جابر اور پُر سطوت بادشاہ کے دربار سے منسلک تھے۔ تاہم آپ کی حق گوئی اور بے باکی کا منہ کبھی بند نہیں ہوا۔ ہارون کو بے لاگ اور دو ٹوک الفاظ میں تنبیہہ کیا کرتے تھے۔ کتابُ الخراج کے دیباچہ میں اسے لکھتے ہیں کہ تو رعیت کا پاسبان ہے۔ کل اللہ کو جواب دینا ہوگا۔ اگر آج غفلت کی تو قیامت کو کیا عُذر پیش کروگے؟

آپ نے ۶۷ برس کی عمر میں ۱۸۲ ہجری میں وفات پائی[۱]

حنفیہ میں آپ پہلے شخص ہیں جن کی تصنیفات دستیاب ہیں۔ آپ کی کتابُ الخراج کو بہت شہرت حاصل ہے۔ اصلاً یہ ایک خط تھا جو آپ نے ہارون کو لکھا۔ اس میں ملکی حاصلات کی مختلف مدّوں مثلاً خراج، زکوٰۃ، صدقات، عُشور اور جزیہ وغیرہ کے بارہ میں ہدایات ہیں۔ آپ کی دو اور تصنیفیں جامع الفتاوٰی اور کتابُ اختلافِ ابی حنیفہ و ابی لیلیٰ[۲] کے نام سے ہیں۔

امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ

آپ ۱۳۲ ہجری میں واسط میں پیدا ہوئے[۳]۔ کوفہ میں نشونما پائی[۴]۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک امام ابویوسف اور وقت کے دیگر ائمہؒ سے استفادہ کیا۔ بیس برس کی عمر میں مسندِ درس سنبھالی[۵]

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ [۲] ابویلیٰ امام اعظم کے ایک معاصر قاضی تھے [۳] البدایہ والنہایہ جلد ا

[۴] الانتقاء حجۃ اللہ [۵] سیرۃ النعمان شبلی

ہارون الرشید نے آپ کو قاضی مقرر کیا۔ ہمیشہ آپ کو ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۸۹ ہجری میں ہارون کے ساتھ دورانِ سفر میں رَے کے مقام پر وفات پائی۔[1]

درباری وابستگی کے باوجود آپ حق گوئی میں بے باک تھے۔ ہارون نے یحییٰ علوی کو امان دی تھی۔ پھر منحرف ہو کر انہیں قید کرنا چاہا۔ محمد بن حسنؒ سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے نہ مانا۔ ہارون غضب ناک ہوا لیکن آپ نے پروانہ کی۔[2]

آپ نہایت فراخ طبع اور سادہ دل تھے۔ امام شافعی آپ کے شاگرد تھے۔ تاہم ان کو آزادانہ مناظرات کا موقع دیتے تھے۔ گھر والوں سے کہا کرتے تھے کہ مجھ سے دنیا کی حاجتیں طلب نہ کرو۔ تم میرا دل دنیا میں اٹکا دیتے ہوئے۔[3]

امام محمد نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل مشہور ہیں:

مَبسُوط ۔ یہ امام ابو یوسفؒ کی ایک تصنیف کی مفصل تر صورت ہے۔

جامعِ صَغیر ۔ اس کتاب میں امام ابو حنیفہؒ کے وہ مسائل درج ہیں جنہیں امام محمد نے امام یوسف کی وساطت سے حاصل کیا ہے۔ بعض مسائل سے آپ نے اختلاف بھی کیا ہے۔

زیادات ۔ اس کو جامع صغیر کا ضمیمہ سمجھ لیجئے۔

جامعِ کبیر ۔ اس میں امام ابو حنیفہ کے مسائل ہیں۔ ساتھ ہی امام ابو یوسف اور امام زُفَر کے اقوال بھی درج ہیں۔ ہر فتوای کے ہمراہ دلیل دی ہے۔

---

[1] انتقاء [2] و [3] البدایہ والنہایہ

حنفی فقہ پر یہ ایک نہایت مفصل اور مستند کتاب ہے۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

کتاب الحُجج۔ امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد مدینہ میں رہ کر امام مالکؒ سے تین برس میں مُوطّا پڑھی مگر ان کے مسلک سے اختلاف باقی رہا۔ یہ کتاب اِسی اختلاف کا مظہر ہے۔ اس میں آپ نے مذہب مالکی کی تردید کی ہے۔

سِیَرِ صغیر اور سِیَرِ کبیر۔ پہلے آپ نے سیرِ صغیر لکھی، بعد میں اسے خوب مبسوط کیا اور نام سیرِ کبیر رکھا۔

آپ کی روایت سے موطا کا ایک نسخہ بھی رائج ہے۔ جو موطائے امام محمد کہلاتا ہے۔

(۳) امام زُفر بن ہُذَیلؒ — آپ ۱۱۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ۱۵۸ ہجری میں وفات پائی۔ آپ بصرہ کے قاضی تھے[۱]۔

(۴) حَسَن بن زیاد لُؤلُوئیؒ — کچھ عرصہ کوفہ کے قاضی رہے۔ پھر استعفاد دے دیا۔ بہت فہیم اور خوش خلق تھے[۲]۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک

فکری خطوط —— امام ابوحنیفہ نے ابتداءً علم الکلام میں مہارت پیدا کی تھی۔ لیکن بعد میں اس سے دست بردار ہو گئے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے زود فہمی اور نکتہ سنجی کا نادرہ کار ملکہ عطا کیا تھا لیکن ایسے مباحث کو بہت ناپسند

۱۔ الانتقاء ۲۔ جواہر المضیئہ از قرشی۔

کرتے تھے جن کا تعلق محض عجائب پسندی سے ہو۔ قدرت کے ناقابلِ ادراک حقائق مثلاً صفاتِ الٰہی، تقدیر وغیرہ کے بارہ میں قرآن وحدیث میں جو کچھ مذکور ہے اس پر بغیر فلسفیانہ کاوشوں کے ایمان لانا کافی ووافی سمجھتے تھے تقدیر میں غور کرنے والے کے بارہ میں کہا کرتے تھے کہ اس کی مثال سورج کی شعاعوں سے نظر ملانے والے کی ہے۔ وہ جس قدر دیکھے گا اس کی سرگشتگی اور بڑھے گی۔[۱]

امام ابوحنیفہ کے ہاں فکروتدبُّر کی وسعت اور فراوانی ہے۔ لیکن اس کا تاروپود سادگی اور بے ساختگی سے بنا ہوا ہے۔ اس میں نہ عقل پرستی کی بے قیدی ہے اور نہ جدت پردازی کے پیچ وخم۔

حدیث:۔ خبرِ متواتر[۲] کا علم قطعی ہوتا ہے اور خبرِ واحد کا ظنی۔ اس لئے امام ابوحنیفہ صرف خبرِ متواتر کو مدارِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ خبرِ واحد پر عمل واجب مانتے ہیں۔ لیکن اسے ایمانیات میں حجت تسلیم نہیں کرتے۔

امام ابوحنیفہؒ خبرِ واحد کو وہ درجہ نہیں دیتے جو اسے شافعی یا حنبلی مسلک میں حاصل ہے۔ لیکن آپ خبرِ مشہور کو خبرِ متواتر کے قریب قریب رتبہ دیتے ہیں۔ مشہور احادیث کثیر ہیں۔

خبرِ واحد کے قبول کا معیار امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بہت کڑا تھا۔

---

[۱] انتقاء

[۲] خبرِ متواتر وہ روایت ہے جس کے راویوں کی تعداد کسی مرحلہ میں چار سے کم نہ ہو اور اس جماعت کے بارہ میں یہ خیال کرنا محال ہو کہ اس نے جھوٹ پر ایکا کیا ہے۔ خبرِ مشہور قطعیت میں خبرِ متواتر کو نہیں پہنچتی۔ اس کے راویوں کی تعداد کسی مرحلہ میں تین سے کم نہیں ہوتی۔ خبرِ مشہور سے کم درجہ کی روایات حنفی فقہ میں آحاد کہلاتی ہیں۔

آپ اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے جس کا تصادم قرآنِ حکیم یا سنّت سے ہو۔

اگر دو روایتیں بظاہر مختلف ہوں۔ ایک فقط ظاہری پہلو رکھتی ہو اور دوسری کی تاویل ہو سکے تو ان کو اس تاویل کے بموجب تطبیق دیتے تھے۔

اگر دو حدیثوں میں ایسا تعارض ہو کہ موافقت کا کوئی پہلو نظر نہ آئے تو ان میں سے اس کو اختیار کرتے تھے جس کی تائید صحابہؓ سے ثابت ہو یا جس کے راوی ضبط و عدالت اور فہم میں فائق تر ہوں۔

اگر خبرِ واحد کا تعارض قیاس سے ہو جائے تو امامِ اعظم خبرِ واحد کو ترجیح دیتے تھے۔ ایسی روایت کو حنفیہ غیرِ قیاسی کہتے ہیں یعنی قیاس کی نگاہ اس کے ادراک سے عاجز ہے۔" امامِ اعظم نے بعض اخبارِ آحاد پر عمل نہیں کیا لیکن اس کا سبب کوئی مخفی سقم تھا یا کوئی دیگر دلیل ورنہ اصولی لحاظ سے امام اعظم کے نزدیک خبرِ واحد کو قیاس پر ترجیح حاصل ہے[1]۔ امام اعظم خبرِ مرسل[2] کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔

اقوالِ صحابہؓ :۔ امام اعظم کے نزدیک کتاب و سنّت کے بعد اجماعِ صحابہؓ کا درجہ ہے۔ صحابہ کرامؓ کا اجماع سنّتِ نبوی کی تفسیر ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں فقط ایک صحابی کا قول ملے اور کسی دیگر صحابی کا فتوای اس کے متضاد نہ ہو تو حنفیہ اسے بھی ایک قسم کا اجماع ——— اجماعِ سکوتی ——— سمجھتے ہیں بشرطیکہ کتاب و سنّت کے منافی نہ ہو۔ اگر صحابہ کی آراء میں اختلاف ہو تو امام اعظم اس قول کو لیتے ہیں جو

لہ جامع المسانید

ٹہ وہ حدیث جس کی سند میں صحابیِ اوّل کا نام حذف ہو۔ ٹہ جامع المسانید

کتاب و سُنّت سے اقرب ہو۔

جو عمل صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں متواتر چلا آیا ہو اسے امام ابوحنیفہ حجت تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ و تابعین سے یہ توقع بے جا ہے کہ انہوں نے سنت سے بالتواتر اختلاف کیا ہوگا۔

اقوالِ تابعین —— امام اعظم خود تابعی تھے اور تابعین کے انفرادی اقوال کے پابند نہ تھے۔ ان میں اجتہاد کرتے تھے۔

اجماع —— امام اعظم نظری لحاظ سے ہر دور میں اجماع کے قائل ہیں

قیاس —— حنفی مسلک میں قیاس پر عمل اُسی صورت میں جائز ہے جب اس کے سوا اور کوئی دلیل فراہم نہ ہو۔

حنفی نقطۂ نگاہ سے قیاس کی بنیاد علّتِ منضبطہ ہے یعنی اصل اور فرع میں اشتراک کی وہ وجہ جو ان ہر دو کو حکم میں مساوی قرار دیتی ہے۔ (قیاس کی یہی تعریف ہم نے آدلۂ شرعیہ کے باب میں لکھی ہے)۔ امام ابوحنیفہ قیاس کے استعمال میں بہت محتاط تھے۔ لیکن آپ نے چونکہ نہ صرف پیش آمدہ مسائل کے حل ڈھونڈے ہیں بلکہ فرضی مسائل میں بھی غور و خوض کیا ہے اس لئے آپ کے ہاں قیاسی فتووں کی ایک وافر تعداد ہے۔ ملک داری اور تمدن کی وسعت روز افزوں تھی۔ امام اعظم نے ناگزیر جانا کہ فقہی تدبر کا دامن بھی وسیع کیا جائے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لابدی تھا کہ رائے کو بے راہ نہ ہونے دیا جائے۔ اس کی حُدود کا تعیّن لازم تھی۔ آپ نے فکر و نظر کے لئے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے اور قیاس کو ایک فن میں ڈھال دیا تاکہ اس میں کسی صورت غلو پیدا نہ ہو سکے۔ مسائل کی کثرت کے باوصف آپ کا مسلک نقل و عقل کا نہایت خوش آئند اور متوازن امتزاج پیش کرتا ہے۔ امام اعظم نے جو ذمّہ داری

اٹھائی وہ کٹھن اور گراں بار تھی۔ اس وقت بعض ائمہ کرام اس روش کے خلاف تھے اور فرضی مسائل ایک طرف، واقع شدہ امور میں بھی جب تک ان کے سامنے کوئی سابقہ نظیر نہ ہوتی رائے دینے سے اجتناب کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے مختلف تھی اور مخالف الرائے گروہ کی طرح تقویٰ پر مبنی تھی۔

اگرچہ علمِ دین ایک نازک ذمّہ داری ہے لیکن آپ اِس ذمّہ داری کی اہلیت رکھتے ہُوئے اس سے گُریز کرنا جُرم سمجھتے تھے۔ آپ کا قول ہے کہ اگر مجھے علم کے ضائع جانے کا خوف نہ ہو تو فتویٰ دینے کا بوجھ کبھی نہ اُٹھاؤں۔

اِستحسان —— حنفیہ کا ایک امتیازی اصول استحسان ہے۔ امام ابُوحنیفہ کے نزدیک اللہؐ اور اس کے رسولؐ کے احکام میں اَسرار و رمُوز ہیں۔ ان کا کامل ادراک ہمارے لئے محال ہے۔ لیکن کتاب وسُنّت کی بعض حکمتوں تک ذہن کی رسائی ہو سکتی ہے۔ کتاب وسنّت نے شریعت کے بعض اصول خود صراحتًہ بتادیئے ہیں اور بعض نُصوص سے مُستَنبط ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات قیاسی فتویٰ ان اصولِ ثابتہ کے خلاف پڑتا ہے۔ ایسے میں قیاسی فتویٰ کو چھوڑ کر ان اصولوں کے تحت فیصلہ کیا جاتا ہے۔ قیاس کو چھوڑ کر اصولِ ثابتہ کی رُو سے فتویٰ دینے کو استحسان کہتے ہیں۔

حنفی مسلک کی اشاعت

امامِ اعظمؒ کا مسلک آپ کی زندگی ہی میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فضیلت مآب تلامذہ نے اس کی

عالم گیر پیمانہ پر اشاعت کی۔ اور بلادِ عجم، ایشیائے کوچک، ترکستان، ہندوستان اور چین تک پہنچ گیا۔ اس مسلک کی اشاعت اب بھی زیادہ تر انہی علاقوں میں ہے۔ پاکستان کی غالب اکثریت حنفی ہے۔

امام مالکؒ

حالاتِ زندگی اسم گرامی مالک اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ اَنس بن مالک اَصبحی کے فرزند تھے جو یمن کے شاہی خاندان حِمیَر کی شاخ اصبح سے تھے۔ ۹۳ ہجری[1] میں پیدا ہوئے۔

امام مالک کے گھرانے کو علم سے بہت اختصاص تھا۔ آپ کے دادا مالک اور چچا ابو سُہیل نافع مدینہ کے مشہور و معروف محدّث تھے[2]۔ آپ نے اَجداد کی علمی راہ اختیار کی۔ قوتِ حافظہ اتنی زبردست تھی کہ جو بات ایک دفعہ خانۂ دماغ میں پہنچتی گھر کر لیتی تھی۔ ایک دفعہ آپ کے اُستاد امام زہری نے چالیس سے زائد حدیثیں پڑھائیں۔ دوسری صبح امام مالک کو لفظ بہ لفظ ازبر تھیں[3]۔ علمی حلقوں میں ایک امتیازی شان کے ساتھ چمکے۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک ستر شیوخ نے اجازت نہ دی مسندِ تدریس پر نہیں بیٹھے[4]۔ تاہم عُنفوانِ شباب ہی تھا کہ ایک پُر رونق درس گاہ کے میرِ مجلس نظر آنے لگے[5]۔ آپ کا شہرہ دور دور تک پھیلا۔ افریقیہ اور اُندلس تک کے تشنہ کامانِ علم مصائبِ سفر اٹھا کر اس قُلزُمِ معانی سے سیراب ہونے کے لئے آئے۔

---

[1] سالِ ولادت میں روایات مختلف ہیں (الانتقاء) [2] المصفّٰی تزئین الممالک زہراوی شرحِ موطّا زرقانی [3] انتقاء۔ تزئین [4] زرقانی

سُفیان بن عُیَینہ کا قول ہے کہ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ پیشگوئی آپ ہی کے حق میں تھی کہ عنقریب وُہ زمانہ آئے گا کہ لوگ اونٹوں پر بیٹھ کر منزلیں کاٹیں گے۔ اور عالمِ مدینہ سے بلند تر عالم کسی کو نہ پائیں گے[1] بنوعباس کے پُرجلال بادشاہوں، ہادی اور ہارون نے آپ کے قدموں میں بیٹھ کر درس سُنا۔ امین اور مؤتمن بھی آپ کے پاس مُوطا پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے[2]

اس زمانہ کے عُلمائے مدینہ کے طریق کے بموجب آپ اپنی تالیف کردہ کتاب مُوطّا سے درس دیتے تھے۔ ایک قابل شاگرد کھڑا ہو کر پڑھتا تھا۔ وہ خطا کرتا تو آپ تصحیح فرما دیتے تھے۔ اس کے بعد تشریح فرماتے۔ معارف کا ایک دریا اُمنڈ پڑتا۔ اور ہر شخص بقدرِ ظرف سیراب ہوتا تھا۔[3]

آپ کو علم حدیث کی تعظیم و اجلال کا بہت اہتمام تھا۔ فقہ کی مجلس میں آپ اِس قدر اہتمام نہیں کرتے تھے لیکن جب تدریسِ حدیث کے لئے بیٹھنا ہوتا تو پہلے نہاتے، خوشبو لگاتے اور اُجلا لباس پہنتے تھے۔ چبوترہ پر خضُوع و خشُوع کے ساتھ رونق افروز ہوتے اور مجلس پر وقار کی فضا طاری ہو جاتی تھی۔ حلقۂ درس میں عطر بیز لہریں موج زن رہتی تھیں۔

آپ کو بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرح عبّاسی خلیفہ منصور کے عہد میں مصیبت اٹھانا پڑی۔ آپ نے اس کے خلاف محمد نفس زکیہ کے حق میں فتوٰی دیا تھا۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ منصوُر خلافت کا اہل نہیں۔ اس نے بزورِ شمشیر

---

[1] مصفّٰی [2] تزئین الممالک [3] تزئین

بیعت لی ہے اور جس طرح جبر کی طلاق نافذ نہیں ہوتی[1] اسی طرح جبری بیعت بھی کالعدم ہے۔ منصور نے میدان جیت لیا اور نفسِ زکیہ شہادت پاگئے[2]۔ منصور کا چچیرا بھائی جعفر مدینہ کا والی ہوا تو اُس نے حکم بھیجا کہ آپ جبری طلاق کے خلاف فتوٰی نہ دیں کیونکہ اس سے منصور کی بیعت کا جواز جاتا ہے۔ آپ اپنی رائے پر جمے رہے۔ جعفر نے آپ کو ننگے بدن کوڑے پٹوائے اور بازو کھنچوا کر شانوں سے اُتروا دیے۔ اس کے بعد اونٹ پر بٹھوا کر گلیوں میں پھروایا۔ تاہم آپ کے ثبات پر آنچ نہ آئی۔ ایسے میں بھی کہ آپ اونٹ کی ننگی پُشت پر زخموں سے چُور بیٹھے تھے زبانِ مبارک سے رہ رہ کر یہ صدا اٹھتی تھی، جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ سُن لے کہ میں مالک بن اَنس ہوں۔ اور فتوٰی دیتا ہوں کہ جبری طلاق باطل ہے۔ جعفر کو معلوم ہوا تو اونٹ سے اُتروا دیا۔ یہ ۱۴۷ ہجری کا واقعہ ہے[3]۔ بعد میں منصور کا سُلوک آپ سے دوستانہ رہا۔ اس نے قضاوت کا عہدہ بھی پیش کیا لیکن آپ نے قبول نہ فرمایا[4]۔

آپ کو مدینۃ النبیؐ سے بے انتہا محبت تھی۔ عمر بھر سوائے سفرِ حج کے اس محبوب شہر سے جُدا نہیں ہوئے۔ بادشاہوں کے بلاوے بھی رد کر دئے۔

مدینہ کی حُرمت کا آپ کو اس قدر پاس تھا کہ اپنے اصطبل میں کئی سواریوں کے باوجود شہر میں ہمیشہ پیدل نکلتے تھے۔ کہا کرتے تھے، مجھے حیا آتی ہے کہ جس شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدنِ مبارک

---

[1] حنفی فقہ میں جبری طلاق نافذ ہوتی ہے [2] البدایہ والنہایہ [3] انتقاد۔ تزئین۔ زواوی [4] زواوی

ہے اس میں سوار ہو کر چلوں؟[1]

آخری سالوں میں بہت نحیف ہو گئے تھے۔ گھلتے ہوئے بدن کو بھی ورثۂ نبوی (علم دین) کی خدمت سے فرصت نہ دی۔ ۱۷۹ ہجری میں رحلت کی۔ اس شہنشاہِ فقر کا جنازہ اس شوکت سے اٹھا کہ والیٔ شہر پا پیادہ شریک ہوا اور راستہ میں جنازہ کو کندھا دیتا گیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ مدینہ کے مقدس قبرستان جنّت البقیع میں ہے۔

اوصاف و خصائل

امام مالک بلند قامت، خوش رُو اور خوش پوشاک تھے۔ صفائی اور خوش وضعی پر جان چھڑکتے تھے۔ مزاج میں انتہا کی نفاست تھی۔ لباس عطر میں بسا رہتا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے آثار صورت سے آشکارا ہونے چاہییں۔

خودداری اور استغناء کا ملکہ آپ میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ شاہانِ وقت کے طنطنہ کو بھی ٹھکرا دیتے تھے۔ آپ کی آنکھوں نے بنو اُمیّہ اور بنو عباس کے ذی احتشام بادشاہوں کی آب و تاب دیکھی لیکن کسی سے خیرہ نہ ہوئیں۔ منصور نے ایک دفعہ مسجد النبی میں آپ سے بحث کی اور اُونچی آواز سے بولا۔ آپ نے فرمایا، آہستہ بولو، پاس مزارِ رسُولؐ ہے۔[2]

عباسی سلسلہ کا تیسرا تاجدار محمد المہدی ۱۶۰ ہجری میں مدینہ آیا اور چاہا کہ امام مالک اس کے دربار میں آ کر شہزادوں موسیٰ اور ہارُون کو موطا پڑھائیں۔ آپ نے انکار فرمایا۔ اس نے شہزادوں کو آپ کی درس گاہ میں بھیجا۔ ان کے اتالیق نے خواہش کی کہ موطا کی قراءت آپ خود کریں۔

---

[1] زوادی [2] زوادی

آپ نے کہا، علمائے سابق کا یہ دستور نہیں۔ ان شاہزادوں میں سے ایک نے کہا، میں آپؒ کی حدیث آبِ زر سے لکھوں گا۔ فرمایا، نہیں۔ اس پر عمل کرو۔[1]

ہارون بادشاہی کے ایّام میں مدینہ آیا تو جناب امام سے درسِ موطا کی خواہش کی۔ فرمایا، بہتر، کل کا دن اس کے لیے ہوگا۔ اگلا دن آیا تو ہارون اپنے ٹھکانے ہمتن کشِ انتظار رہ گیا۔ ہارون آپ کی آمد کا طالب تھا اور آپ کو اس کی حاضری کی توقع تھی۔ آپ درس میں مصروف رہے۔ ہارون نے بلوایا۔ آپ نے کہلا بھیجا، اَلعِلمُ یُزَارُ وَلَا یَزُورُ (علم کے پاس لوگ خود آتے ہیں۔ یہ کسی کے پاس نہیں جاتا)۔ اس کے بعد اس کے خیمہ میں جاکر کہا، علم تمہارے گھرانے سے نکلا ہے۔ چاہو تو اسے عزت دو اور چاہو تو ذلیل کردو۔ علم کو پست کرنے میں پہل نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں پست کر دے گا۔ ہارون نے کہا، ہم خود آئیں گے۔ آپ اس دوران میں عوام کو منع کردیں۔ فرمایا، جب علم کو عوام سے روک دیا جائے تو نہ خواصؒ کے کام آتا ہے نہ عوامؒ کے۔ ہارون بولا، قراءت آپ خود کریں۔ جواب دیا، میرا یہ قاعدہ نہیں۔ ہارون مجلس میں حاضر ہوا۔ اور آکر چبوترہ پر ہو بیٹھا۔ آپ نے اچھا نہ جانا اور فرمایا، مدینہ کے لوگ تواضع کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ہارون اٹھ کر آپ کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔[2]

طبیعت کے ضبط اور استقلال کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک بار آپ کے موزوں میں بچھو تھا۔ آپ کو معلوم نہ تھا، موزے پہن کر آگئے۔ دورانِ درس بچھو نے کئی بار ڈسا۔ چہرے پر کرب کے آثار ہویدا ہوئے، لیکن ضبط کے خیال سے پہلو تک نہ بدلا۔ مجلس کے خاتمہ کے بعد، بچھو

---

[1] تزئین [2] تزئین

نکالا۔[1]

آپ کے مزاج میں انتہاء کا تحمل تھا۔ مدینہ کے والی نے آپ کو بے گناہ دُکھ دیا تھا۔ منصور نے اسے سزا دینا چاہی تو آپ نے معاف کر دیا۔[2]

آپ فیاض اور کُشادہ دل تھے۔ طلبہ کی حاجتوں کا پورا خیال رکھتے تھے۔ امام شافعیؒ پر بہت مہربان تھے۔ مالی طور سے ان کی بڑی دستگیری کرتے تھے۔

اہلِ علم کے قدردان تھے۔ امام ابو حنیفہؒ سے نظری اختلاف تھا تاہم ان کے کمالات کے معترف تھے۔ انصاف پسندی اور رواداری اس وقت کے علماء کا خاصہ تھا۔ منصور اور ہارون نے چاہا کہ مؤطا کو بہ زورِ شمشیر کل مملکت میں منوائیں۔ آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مسلمانوں میں احادیث اور اقوالِ علماء کی اشاعت ہو چکی۔ اب وہ ان پر عمل پیرا ہیں۔ آپ انہیں اپنے حال پر رہنے دیں۔ علماء کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اُمت پر ایک رحمت ہے۔ کسی پر جبر کرنا روا نہیں۔ آپ اہلِ اسلام کو ایک شخص کے علم پر جمع نہ کریں کیونکہ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔[3]

تدوینِ فقہ اور تالیفات

امام مالک نے احادیث کا ایک مجموعہ مؤطا نام خود مرتب کیا تھا۔ اس سے حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے۔ فقہی مسائل کی کوئی کتاب آپ نے اپنے ہاتھ سے مدوّن نہیں کی۔

---

[1] زوادی [2] زوادی۔ [3] زوادی

آپ کے اکثر مسائل المُدَوَّنَۃُ الکُبریٰ میں محفوظ ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک قرآن اور موطّا کے بعد یہی کتاب اساسِ علم ہے۔ اسے امام سحنون نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کے مصدر امام مالک کے شاگرد عبدالرحمٰن بن قاسم (متوفی ۱۹۱ھ) ہیں۔ آپ مصر میں مقیم تھے۔ مغربؔ کے ایک عالم اَسَد بن فرات (متوفی ۲۴۰ھ) نے آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے مسائل قلمبند کئے اور کتاب کا نام اَسَدِیّہ رکھا۔ واپس مغرب گئے تو امام سحنون نے ان سے اسدیّہ کی نقل لی۔ اسے ساتھ لے کر مصر آئے اور امام عبدالرحمٰن بن قاسم کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے اس میں کمی بیشی کی۔ جب سحنون مغرب کی طرف لَوٹے تو ابن قاسم نے اسد بن فرات کے نام ایک خط لکھ کر دیا کہ اپنی کتاب اَسدیّہ کو سحنُون کی کتاب کے مطابق کر لو۔ اسد نہ مانے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی کتاب مستند نہ رہی۔ لوگوں نے سحنون کی طرف رجوع کیا۔ ان کی کتاب المُدَوَّنَۃ کے نام سے شہرت یاب ہو گئی۔[۲]

مُوَطّا — امام مالکؒ کے نام جو تالیفات منسوب کی جاتی ہیں ان میں سے صرف موطّا کے بارہ میں قطعیت سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ کا کارنامہ ہے۔

علمائے مدینہ کا دستور تھا کہ حدیث و فقہ کی تعلیم اپنی تحریر کردہ کتابوں سے دیتے تھے۔ امام مالک نے بھی اس مقصد کے لئے حدیث کا ایک مجموعہ لکھا اور اس کا نام موطّا رکھا۔

اس مجموعہ کی آپ ساتھ ساتھ تہذیب و تنقیح بھی کرتے رہے اور ترتیب بھی سنوارتے رہے۔ شروع میں دس ہزار احادیث تھیں۔ کم ہوتے ہوتے ۱،۷۲۰ رہ گئیں۔ ان میں بھی مرفوع حدیثیں کل ۸۲۲ ہیں۔ تدریجی ترمیم کے سبب

---

[۱] مصر کے مغرب اور صحرائے اعظم کے شمال میں جو آباد علاقہ ہے اسے مغرب یا افریقیہ کہتے ہیں۔

[۲] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰۔ مقدمۃ المُدَوَّنہ

سے موطا کی تقریباً تیس مختلف روایات شائع ہو گئیں۔ اب بھی تقریباً بارہ نسخوں کے نام معلوم ہیں[1]۔

موطا کے لغوی معنی ہیں: سنوارا ہوا، ہموار کردہ، تحقیق شدہ، متفق علیہ۔ موطا اس رستہ کو بھی کہتے ہیں جس پر لوگوں کا عام گزر ہو۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نام رکھتے وقت امام مالکؒ کے سامنے موطا کا کون سا مفہوم تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ موطا منصور یا اس کے کسی جانشین کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ غلط ہے۔ علمائے مدینہ کا اس وقت یہ طریق تھا کہ کتاب سے پڑھاتے تھے۔ لہٰذا شاہی فرمائش کی حاجت نہ تھی۔

موطا کے اس وقت دو ہی نسخے کاملاً دستیاب ہیں۔ ایک موطائے مالک کہلاتا ہے۔ اسے امام مالک کے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اندلسی (متوفی ۲۳۴ھ) نے روایت کیا ہے۔ دوسرا نسخہ حنفی امام محمدؒ سے منقول ہے۔ اسے موطائے محمدؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فقط موطا کے نام کا اطلاق موطائے مالک پر ہوتا ہے۔

موطا مختصر کتاب ہے۔ اس کی غرض فقط سُنَن یعنی احکامی روایات سے ہے۔ اس میں تاریخ و قصص کا دخل نہیں۔ ارشاداتِ نبوی کے ساتھ ساتھ ثقاتِ صحابہ و تابعین کے اقوال اور اجماعِ مدینہ کو بھی آپ نے درج کردیا ہے کیونکہ ان کا سرچشمہ بھی ذاتِ نبوی ہی تھی۔

موطا کی روایات صحیح ہیں اور شک و شبہ سے بالا۔

امام مالک کا مسلک

فکری خطوط۔۔ حضرت امام مالک مابعد الطبیعیات کے بعید از فہم مسائل سے

[1] مصفّیٰ

بہت دُور رہتے تھے۔ ایک شخص نے آپ سے اللہ تعالیٰ کی عرش نشینی کے بارہ میں فلسفہ پوچھا۔ آپ نے اسے مجلس سے نکلوا دیا۔[1] اللہ کی صفات سے متعلق جو احادیث ہیں ان پر مطلق ایمان رکھتے تھے۔ صفاتِ الٰہی اور تقدیر وغیرہ کی کرید میں نہیں پڑتے تھے اور نہ اس بنا پر فرقہ بازی کے قائل تھے۔ ایک شخص نے پوچھا، اہل السُّنّت والجماعت کون ہیں؟ فرمایا، جن کا کوئی لقب (مثلاً جہمی یا قدری وغیرہ) نہیں۔[2]

امام مالک نہایت سادہ فکر کے مالک تھے۔ زیادہ باتیں بھی ناپسند کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ درستی قلیل باتوں میں ہوتی ہے۔[3]

آپ کا قول ہے لَيْسَ الْجِدَالُ فِي الدِّيْنِ بِشَيْءٍ (دین میں جدال کوئی چیز نہیں) قرآن اور سُنّتِ نبوی ہی ان کی فکر کا مرکز و محور تھی۔ کہا کرتے تھے کہ سُنّت نوح کا سفینہ ہے۔ جو اس میں بیٹھا بچ رہا اور جو رہ گیا غرق ہوا۔[4]

حدیث ——— امام مالک خبرِ واحد پر ایمان کی بُنیاد نہیں رکھتے۔ لیکن اس پر عمل ضروری قرار دیتے تھے۔

امام مالک قبولِ حدیث کے باب میں بہت متشدّد تھے۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ کے فقہا پر تنقید کی ہے۔[5] کہا کرتے تھے کہ علمِ حدیث دین ہے۔ دیکھو کس سے لیتے ہو۔[6] آپ نے روایت کے قبول کرنے کا یہ معیار مقرر کیا تھا۔

(ک) روایت قرآن کے معارِض نہ ہو۔

---

[1] تزئین [2] انتقاء [3] زوادی ص ۴۰ [4] زوادی ص ۳۸

[5] تہذیب التہذیب [6] انتقاء۔ تزئین

(ب) راوی کا حافظہ قوی ہو۔ اگر اس کا حافظہ قوی نہ ہو اور اس کے ماسوا ہر لحاظ سے قابلِ اعتبار ہو تو جب بھی اس کی حدیث نہ لو چاہے اس نے اپنے کانوں سے سُن کر لکھ بھی لی ہو۔ عین ممکن ہے کہ اس کی تحریر میں کسی نے جعل سازی کر دی ہو[1]۔

(ج) راوی عام بول چال میں دروغ گو ہو تو اس کی روایت نہ لی جائے چاہے حدیثِ نبوی میں صادق ہو[2]۔

(د) راوی فہیم ہو۔ جس راوی کو دین کی سمجھ نہ ہو اس کی حدیث کا اعتبار نہیں۔ آپ کا قول ہے کہ صرف اس راوی سے حدیث لو جو جانتا بھی ہو کہ کیا کہہ رہا ہے[3]۔

آپ کا بیان ہے کہ میں نے مسجد النبی کے ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو حدیث کا درس دیتے دیکھا ہے لیکن ان میں سے ایک سے بھی علم نہیں سیکھا، حالانکہ یہ بڑے امانت دار ہیں۔ تاہم علم کے شایاں نہیں تھے[4]۔ آپ نافہم آدمی کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے[5]۔

(ر) حدیث اجماعِ مدینہ کے خلاف نہ ہو۔ آپ نے امام زہری ایسے جلیل القدر اساتذہ کی بھی بعض روایتیں اس لئے نہ لیں کہ مدینہ والوں کا ان پر عمل نہ تھا[6]۔

(س) روایت دین کے اصولِ ثابتہ کے خلاف نہ ہو[7]۔

---

[1] انتقاد ؛ [2] ابن عساکر (مختصر) ج ۲ ص ۱۷۲ ؛ [3] حلیہ ابونعیم ؛ [4] انتقاد
[5] زواوی ص ۴۶ ؛ [6] سہم المصیب۔ جامع المسانید باب اول ؛ [7] ابونعیم
[8] استاد ابو زہرہ دیکھو ترجمان القرآن جنوری ۱۹۵۷ء

(ص) حدیث بالمعنی اس صورت میں لیتے تھے کہ حروف کا فرق معمولی ہو۔[۱]

(ط) راوی علم کا جویا ہو، اربابِ علم کا صحبت نشین ہو اور باعمل ہو۔ آپ کا ارشاد ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے، جسے چاہے عطا کر دے۔ علم کثرتِ روایت کا نام نہیں۔[۲]

آپ کو جس حدیث میں شک گزرتا اسے چھوڑ دیتے تھے۔[۳]

اِجماع —— امام مالک کے نزدیک کتاب و سنّت کے بعد حجّت کا درجہ اجماع کو حاصل ہے۔ لیکن صرف اجماعِ مدینہ کو معتبر جانتے تھے۔ مدینہ میں ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری گیارہ برس گزارے تھے۔ حضورؐ کی سنّت مدینہ والوں کے تعامل میں محفوظ تھی۔ امام مالک مدینہ کے تعامل کو اس دلیل سے خبرِ واحد پر ترجیح دیتے تھے کہ خبرِ واحد میں خطا و نسیان کا احتمال ہو سکتا ہے لیکن شہر بھر کے مجموعی عمل میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ثقہ راوی کی روایت اجماعِ مدینہ کے موافق ہوتی تو امام مالک اسے قبول کر لیتے تھے، چاہے منقطع ہی کیوں نہ ہو۔ بعض روایات آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر واسطہ کے بیان کرتے ہیں۔ ایسی روایات بلاغاتِ مالک کہلاتی ہیں۔ ان کو اجماعِ مدینہ کے موافق پایا اس لئے سند لانا ضروری نہ جانا۔

آپ کے نزدیک فقہ وہی درست تھا جو حجاز میں رائج تھا جہاں کا

---

[۱] الانتقاد [۲] ابن عساکر (مختصر) ۲-۱۲۲، زواوی ص ۳۹- تزئین ص ۱۷

[۳] زواوی ص ۱۴ و ۳۲

علمی مرکز مدینہ تھا۔ آپ نے مدینہ کے محدثین کے سوا صرف چھ شیوخ سے حدیث اخذ کی ہے[1] اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیگر مکاتب فقہ کو آپ درست نہیں جانتے تھے۔ آپ بہت فراخ دل تھے اور سب مجتہدین کو برسرِ حق تسلیم کرتے تھے۔

اقوالِ صحابہؓ —— صحابی کے قول کو قیاس پر ترجیح دیتے تھے[2]۔ لیکن جہاں صحابی کا انفرادی قول اجماعِ مدینہ کے موافق نہ ہوتا اس کو ترک کر دیتے تھے۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے کئی فتووں سے اختلاف کیا ہے۔

قیاس —— امام مالک قیاس کے معاملہ میں بہت محتاط تھے۔ مفروضہ مسائل میں فتوٰی نہیں دیتے تھے۔ واقعاتی مسائل میں بھی جہاں سمجھ کام نہیں کرتی تھی وہاں صاف کہہ دیتے تھے، لَا اَدْرِیْ (میں نہیں جانتا)۔ آپ کا قول ہے کہ عالم کو چاہیے[3] اپنے جانشینوں کو لا اَدرِی کہنے کی جُرأت سکھا جائے[4]۔

امام مالکؒ اپنے قول کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے۔ ممالک بعیدہ سے آنے والوں کے فتاوٰی کا جواب نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے، ہو سکتا ہے کہ کسی قیاسی مسئلہ میں کل اپنی رائے سے رجوع کر لوں۔ اس وقت انہیں کون اطلاع دے گا۔ ان کے علماء موجود ہیں، ان سے پوچھیں[5]۔ ایک شخص بہت دور سے فتوٰی لینے آیا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں اس کا اچھا حل نہیں بتا سکتا۔ اس نے کہا کہ جناب میں بہت سفر کاٹ کر آیا ہوں۔ واپس

---

[1] انتقاد [2] اعلام الموقعین ص ۲۶

[3] انتقاد۔ تزئین [4] تزئین۔ [5] زواوی

جا کر لوگوں سے کیا کہوں گا؟ فرمایا، ان سے کہنا، امام مالک کہتے ہیں کہ میرے پاس اس کا اچھا حل نہیں۔[۱]

جن مسائل میں دو فتووں کا احتمال ہوتا وہاں دونوں بیان کر دیتے تھے۔[۲]

اِستِصلَاح —— امام مالک کے ہاں حنفیہ کے استحسان سے ایک حد تک متوازن اصول استصلاح ہے۔ مالکیہ کے ہاں اصول ثابتہ کی جان مصلحتِ عامہ یعنی عوام کی فلاح و بہبود کا اصول ہے۔ امام مالک بعض اوقات قیاس کو چھوڑ کر مصلحتِ عامہ کے موافق فتویٰ دیتے تھے۔ اسے استصلاح کہتے ہیں۔

مالکی مسلک کی اشاعت

امام مالک کا مذہب حجاز، مصر، مغرب (افریقیہ) اور اندلس میں بہت مقبول ہوا۔ اندلس سے تو اسلامی حکومت مدّت ہوئی ناپید ہو چکی ہے۔ آج کل مغرب میں اسی مسلک کا سکّہ رواں ہے۔ قطر، بحرین اور کویت میں مالکیہ ہی ہیں۔ مصر میں ان کی کثیر تعداد ہے۔ کچھ احساء اور عراق میں بھی ہیں۔

---

[۱] ابونعیم [۲] مثلاً المدوّنہ باب الاعتکاف میں ایسی کئی مثالیں ہیں۔

امام شافعیؒ

حالاتِ زندگی ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعیؒ ۱۵۰ھ میں ارضِ مقدس میں پیدا ہوئے۔ آپ قریشی تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب عبدِ مناف پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کے اجداد میں ایک صحابی شافعؓ نامی تھے۔ ان کی نسبت سے شافعی کہلائے۔

آپ کم سنی میں یتیم ہو گئے۔ آپ کی والدہ جو یمنی قبیلہ سے تھیں آپ کو دو برس کی عمر میں مکہ لائیں۔ قدرت نے ذہنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا تھا نو برس کی عمر تک آپ نے قرآن شریف از بر کر لیا[1]۔ اس کے بعد حفظِ حدیث میں محو ہوئے۔ یتیمی اور ناداری نے ہر قدم پر روکنا چاہا لیکن آپ کی اولوالعزمی میں کمی نہ آئی۔

---

[1] جواہر المضیۃ۔ تہذیب التہذیب میں حفظ قرآن کی عمر ۷ برس ہے۔ لیکن ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ ۱۰ برس میں آپ نے قرآن شریف پڑھ لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حفظ ۳ برس بعد کیا۔

آپ تیرہ برس کے تھے کہ امام مالک کی مؤطا حفظ کر لی اور امام مالک کے پاس مدینہ حاضر ہوئے۔ وہ آپ سے متاثر ہوئے اور فرمایا، اللہ سے ڈرتے رہنا اور گناہوں سے اجتناب رکھنا۔ تمہاری ایک نرالی شان ہوگی۔ اللہ نے تمہارے دل میں ایک نور ڈالا ہے۔ اسے گناہوں سے بجھا نہ دینا[1] آپ تین برس متواتر حضرتِ امام مالک سے مستفیض ہوئے۔

اس کے بعد مکہ سے ہوتے ہوئے یمن پہنچے اور قبیلۂ ہذیل میں قیام کیا۔ یہ قبیلہ فصاحت اور شستہ بیانی میں تمام عرب میں ممتاز تھا۔ آپ چار برس تک اس کے سفر و حضر میں شریک رہے اور صحرائی زندگی کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اس اثناء میں آپ نے عربیت، فصاحت و بلاغت اور لغت و نحو میں کمال پیدا کیا[2][3] اس تکمیل کے بعد واپس امام مالک کے پاس مدینہ حاضر ہوئے اور ان کی وفات تک جو ۱۷۹ ہجری میں واقع ہوئی برابر ان کے آستانۂ علم سے وابستہ رہے[4]

امام مالک کی رحلت کے بعد مکہ آئے۔ اس وقت یمن کا والی مکہ میں تھا۔ وہ آپ کو ساتھ لے گیا اور ملازمت دلوا دی۔ کچھ مدت کے بعد نجران کے قاضی مقرر ہوئے۔ آپ بہت دیانت دار اور راست باز تھے۔ خوشامد اور رشوت کے تمام رخنے مسدود کر دیئے۔ دشمن نے سازش کے جال پھیلائے اور ہارون الرشید سے چغلی کھائی کہ شافعی سادات کی حکومت کے لئے راہ

---

[1] مناقب شافعی امام نووی

[2] ابو نعیم ذکر مالک

[3] نووی — ۲۰ برس کی عمر میں عربیت، بلاغت اور صرف و نحو میں کمال پیدا کیا۔

[4] الشافعی از ابو زہرہ - ابو نعیم

ہموار کر رہے ہیں۔ آپ تین سو سادات کے ہمراہ گرفتار ہو کر بغداد میں خلیفہ ہارون کے پاس حاضر کئے گئے۔ وہ آپ کے علم وفقاہت اور خوش بیانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ نہ صرف رہا کر دیا بلکہ بہت عزت افزائی کی۔ یہ ماجرا ۱۸۴ ہجری کا ہے[1]

یہ واقعہ امام شافعیؒ کی زندگی میں ایک موڑ ثابت ہوا۔ آپ کو ہارونُ الرشید کے قاضی امام محمد کی مجلس نصیب ہوئی۔ امام محمد حنفی فقہ کے ایک ستون تھے۔ ان سے عراقی فقہ کا مطالعہ کیا اور ملازمت سے دل ہٹا کر علم میں ہمہ تن کھو گئے۔ مامون نے آپ کو پوری مملکت کا قاضی القضاۃ بنانا چاہا۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا۔[2]

امام شافعی امام محمد کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی حنفی فقہ کے قائل نہ تھے۔ فراخ دِلی اور کشادہ نظری کے دن تھے۔ آپ کے امام محمد کے ساتھ نہایت آزادانہ مناظرے رہتے تھے۔ امام محمد آپ کی فضیلت کے معترف تھے اور آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ امام شافعی نے اس اثناء میں عراقی فقہ کی ضخیم کتابیں نقل کیں۔ بغداد سے مکّہ تشریف لائے اور تدریس شروع کی۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نظریات کے بغور مطالعہ اور مقابلہ و موازنہ کے بعد آپ نے ایک نئے طریق فکر کی بنا رکھی جسے ہم شافعی مذہب کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مسلک پر کتابیں لکھیں اور ان کی اشاعت کی۔ دو دفعہ بغداد بھی تشریف لے گئے اور اپنے نظریات کی ترویج کی۔

آپ نے ۲۰۰ ہجری کے لگ بھگ مصر میں قدم رنجہ فرمایا اور زندگی کے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ - الانتقاد [2] فتح العلام جلد ۲ کتاب القضاء

باقی چار برس وہیں گزارے۔ اسلامی دیار و امصار کے طلبہ وہیں حاضر ہو کر آپ سے اکتساب فیض کرتے تھے[۱] آپ نے ۲۰۴ ہجری میں مصر میں وفات پائی۔

اوصاف و خصائل

حضرت امام شافعیؒ کا قول ہے کہ میں نے عمر بھر جھوٹ نہیں بولا اور نہ کبھی جھوٹ یا سچ قسم کھائی۔ جناب شافعی فقیر منش تھے۔ ابتدائی زندگی پر عسرت کا غلبہ رہا لیکن بعد میں دولت قدم چومنے لگی۔ ایسے میں بھی آپ لذاتِ دنیا سے دامن کش رہے۔ جو مال ہاتھ میں آتا غرباء اور اہلِ حاجت میں لٹا دیتے تھے۔ بعض اوقات گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہ رہتی تھی[۲]

ملازمت کے ایام میں ایک دفعہ مکہ آئے۔ آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ مکہ سے باہر خیمہ لگایا کل رقم عوام میں تقسیم کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے[۳]

ایک رات مسجد سے گھر گئے تو ایک شخص نے دروازہ پر حاضر ہو کر ایک تھیلی نقدی کی پیش کی۔ آپ نے اسے لیا ہی تھا کہ ایک حاجت مند آیا اور رقم کی درخواست کی۔ سالم تھیلی حوالے کر دی[۴]

تدوینِ فقہ اور تصنیفات

امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ کے اصول پر کتابیں لکھیں[۵] اور ان کی اشاعت کی۔ آپ نے اپنے مسلک کی تائید میں خوب زوردار دلائل پیش کئے اور مخالفین کے نظریات کو توڑنے میں حسنِ تحریر اور حسنِ منطق دونوں کا کمال دکھایا۔

---

[۱] انتقاء۔ ابونعیم۔ نووی [۲] ابونعیم ص ۱۳۲

[۳] نووی [۴] ابونعیم ص ۱۳۲

ہموار کر رہے ہیں۔ آپ تین سو سادات کے ہمراہ گرفتار ہو کر بغداد میں خلیفہ ہارون کے پاس حاضر کئے گئے۔ وہ آپ کے علم و فقاہت اور خوش بیانی سے اس قدر متاثر ہوا کہ نہ صرف رہا کر دیا بلکہ بہت عزت افزائی کی۔ یہ ماجرا ۱۸۴ ہجری کا ہے[1]

یہ واقعہ امام شافعیؒ کی زندگی میں ایک موڑ ثابت ہوا۔ آپ کو ہارونؒ الرشید کے قاضی امام محمد کی مجلس نصیب ہوئی۔ امام محمد حنفی فقہ کے ایک ستون تھے۔ ان سے عراقی فقہ کا مطالعہ کیا اور ملازمت سے دل ہٹا کر علم میں ہمہ تن کھو گئے۔ مامون نے آپ کو پوری مملکت کا قاضی القضاۃ بنانا چاہا۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا[2]

امام شافعی امام محمد کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی حنفی فقہ کے قائل نہ تھے۔ فراخ دلی اور کشادہ نظری کے دن تھے۔ آپ کے امام محمد کے ساتھ نہایت آزادانہ مناظرے رہتے تھے۔ امام محمد آپ کی فضیلت کے معترف تھے اور آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ امام شافعی نے اس اثناء میں عراقی فقہ کی ضخیم کتابیں نقل کیں۔ بغداد سے مکہ تشریف لائے اور تدریس شروع کی۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نظریات کے بغور مطالعہ اور مقابلہ و موازنہ کے بعد آپ نے ایک نئے طریق فکر کی بنا رکھی جسے ہم شافعی مذہب کہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مسلک پر کتابیں لکھیں اور ان کی اشاعت کی۔ دو دفعہ بغداد بھی تشریف لے گئے اور اپنے نظریات کی ترویج کی۔

آپ نے ۲۰۰ ہجری کے لگ بھگ مصر میں قدم رنجہ فرمایا اور زندگی کے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰۔ الانتقاء [2] فتح السلام جلد ۲ کتاب القضاء

باقی چار برس وہیں گزارے۔ اسلامی دیار و امصار کے طلبہ وہیں حاضر ہو کر آپ سے اکتساب فیض کرتے تھے[1] آپ نے ۲۰۴ ہجری میں مصر میں وفات پائی۔

اوصاف و خصائل

حضرت امام شافعیؒ کا قول ہے کہ میں نے عمر بھر جھوٹ نہیں بولا اور نہ کبھی جھوٹ یا سچ قسم کھائی۔ جناب شافعی فقیر مَنش تھے۔ ابتدائی زندگی پر عُسرت کا غلبہ رہا لیکن بعد میں دولت قدم چومنے لگی۔ ایسے میں بھی آپ لذاتِ دنیا سے دامن کش رہے۔ جو مال ہاتھ میں آتا غرباء اور اہلِ حاجت میں لُٹا دیتے تھے۔ بعض اوقات گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہ رہتی تھی[2]

ملازمت کے ایام میں ایک دفعہ مکہ آئے۔ آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ مکّہ سے باہر خیمہ لگایا کل رقم عوام میں تقسیم کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے[3]

ایک رات مسجد سے گھر گئے تو ایک شخص نے دروازہ پر حاضر ہو کر ایک تھیلی نقدی کی پیش کی۔ آپ نے اسے لیا ہی تھا کہ ایک حاجت مند آیا اور رقم کی درخواست کی۔ سالم تھیلی حوالے کر دی[4]

تدوینِ فقہ اور تصنیفات

امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ کے اصول پر کتابیں لکھیں[5] اور ان کی اشاعت کی۔ آپ نے اپنے مسلک کی تائید میں خوب زوردار دلائل پیش کئے اور مخالفین کے نظریات کو توڑنے میں حُسنِ تحریر اور حُسنِ منطق دونوں کا کمال دکھایا۔

---

[1] انتقاء۔ ابونعیم۔ نووی [2] ابونعیم ص ۱۳۲

[3] نووی [4] ابونعیم ص ۱۳۲

آپ نے آخری چار سال مصر میں قیام رکھا۔ اس اثناء میں آپ کے خیالات میں کچھ تبدیلی آئی۔ آپ نے اپنے مسلک کی ترمیم کی اور کتابوں پر نظر ثانی کی[1] آپ کا مذہب دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: قدیم اور جدید۔ یہ آپ کی حق پرستی اور کشادہ ظرفی کی دلیل ہے کہ اپنی جن آراء کو درستی کے قابل جانا ان میں بغیر کسی عار کے ترمیم کردی۔

آپ کی تصنیفات ۱۱۳ بتائی جاتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ نو کتابیں مشہور ہیں اور دستیاب بھی ہیں۔ ان کا مختصر تذکرہ ذیل میں درج ہے۔

کتابُ السُّنَن — بالعموم مُسْنَدِ شافعی کہلاتی ہے۔ یہ احکامی احادیث کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ اس کا انداز موطا سے ملتا ہے۔ اس میں حدیث اور فقہ کا امتزاج ہے۔ یہ امام شافعی نے خود نہیں لکھی۔ آپ کے ایک پیرو ابو العباس محمد بن یعقوب نے مرتب کی ہے[2]

رسالۃُ الامام — اسے اَلرِّسالۃُ الاصولیہ اور اَلرِّسالۃ فِی اَدِلَّتِ الاَحکام بھی کہتے ہیں۔ بغداد میں لکھا تھا[3]

اس کتاب میں سنت، اجماع اور قیاس پر اصولی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے اور استنباط کے قواعد وحدود کا تعین کیا گیا ہے۔

آپ کے مذہب کی بنیادی یہی رسالہ ہے۔ پہلے بغداد میں لکھا تھا۔ پھر مصر میں ازسرِنو تحریر کیا۔ اس میں آپ کے اصول کُتب مباحث نہیں۔ کچھ آپ کی دیگر کتابوں میں بھی ہیں مثلاً کتاب الاُمّ، جامع العلم، ابطالُ الاستحسان وغیرہ۔

کتابُ الاُمّ — اسے مبسوط اور حُجّہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں امام شافعی نے فقہی مسائل ابواب میں مرتب کئے ہیں۔ اس کا انداز جدلی ہے۔ مخالفین کے

---

[1] نووی۔ الشافعی از ابوزہرہ [2] بستان المحدثین [3] نووی

اعتراضات پوری قوت کے ساتھ لکھے ہیں اور پھر ان کی تردید پر خوب زور صرف کیا ہے۔ اس کتاب کا پیرایہ اچھوتا اور دل فریب ہے۔ دلیل آرائی اور نکتہ وری کا شہکار ہے۔

اِختِلافُ الحدیث — اس میں اختلافِ حدیث پر بحث ہے۔ خبرِ واحد کی زوردار تائید کرتے ہیں۔

کُتُب خِلافیات — آپ نے مختلف فقہی مذاہب اور علماء کے اختلاف پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے چھ موجود ہیں۔ ان میں جماع العلم اور اِبطال الاستحسان بہت معروف ہیں۔

امام شافعی کا مسلک

فکری خطوط — حضرت امام شافعی جناب امام ابو حنیفہ کی طرح فراست و ذکاوت اور استدلال کے جوہروں سے مالا مال تھے۔ آپ کی کتابیں فقیہانہ دقیقہ سنجی سے معمور ہیں۔ آپ کا استدلال آزادہ روی سے بہت دور تھا اور کتاب و سنت اور آثارِ سلف میں محدود۔ آپ علم الکلام کو ناپسند کرتے تھے۔

آپ لغت اور عربیت میں کمال رکھتے تھے۔ استدلال میں لغت سے بہت کام لیتے تھے۔ نُصوص کے لفظ و عبارت کی ظاہری تشریح پر بہت تاکید کرتے تھے۔ باطن کی طرف صرف قوی دلیل کی صورت میں مائل ہوتے تھے۔ امام شافعی تا حدِّ امکان نصوص کا ظاہری مفہوم لیتے تھے۔ اگر عبارت ایک سے زائد معانی کی متحمل ہو تو آپ کے نزدیک وہی معنی زیادہ مناسب ہوتے ہیں جو اس کے ظاہری پہلو سے قریب تر ہوں[1]

حدیث — امام شافعیؒ اپنے پیش رو ائمہؒ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی طرح خبرِ واحد کو ایمانیات میں حجت نہیں مانتے تھے اور احکام میں اس پر عمل

---

[1] انصاف

لازم قرار دیتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے عہد تک حدیث کی سند میں واسطے کم تھے اور حدیث کے متن کی تنقید آسانی سے ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ حدیثِ مُرسَل کو بھی لے لیتے تھے۔ لیکن امام شافعی کے عصر تک سند کے سلسلے طویل ہو گئے۔ اس لئے آپ نے مُرسَل روایات کو قبول کیا بھی تو بعض شرائط کے تحت۔ صرف حضرت سعید بن مُسَیَّب کی مراسیل کو تسلیم کرتے تھے[1]

حدیث کی سند کو آپ خوب پرکھتے تھے اور ضعیف حدیث کو قابلِ حجت تسلیم نہیں کرتے تھے[2]

اگر دو ہم پلّہ حدیثوں کو معارض پاتے تو ان میں سے اسے قبول کرتے جس کی سند زیادہ قوی اور صحیح ہوتی تھی[3]

اقوالِ صحابہؓ ــــــ امام شافعی اجماعِ صحابہ کو حجت مانتے تھے۔ اگر صحابہ میں اختلاف ہوتا تو اس فتوٰی پر عمل کرتے جسے کتاب و سنت سے اقرب دیکھتے تھے۔

اجماع ــــــ کتاب و سنّت کے بعد اجماع امام شافعیؒ کے نزدیک تیسرا مصدرِ شریعت ہے۔ آپ نظری طور سے ہر دور کے لئے اجماع کے قائل تھے۔ مثلاً ہارون کے دربار میں آپ سے پوچھا گیا کہ کیا تم اجماع کو مانتے ہو؟ کہا، ہاں۔ پھر سوال ہوا کہ بتاؤ کس چیز پر لوگوں کا اجماع ہے؟ جواب دیا، اس بات پر کہ یہ امیر المومنین بیٹھے ہیں، جو انکار کرے مار دیا جائے[4]

---

[1] انصاف شاہ ولی اللہ [2] انصاف
[3] انصاف۔ الشافعی ص ۲۲۸ [4] ابونعیم

دین میں آپ کے نزدیک اجماع اہلِ علم کے متفقہ قول کا نام ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ یہ اجماع صحابہ کے بعد میسّر نہیں آ سکتا۔ صحابہ کے جو اجماعی اقوال نقل در نقل چلے آتے ہیں اب انہی کی حیثیت اجماع کی رہ گئی ہے۔ اسے امام شافعی اجماعِ متواتر کہتے تھے[1]

آپ کا نظریہ ہے کہ اصول پر اجماع ہر دور میں ممکن ہے لیکن فروع میں سوائے اجماعِ متواتر کے ممکن نہیں۔ اسلامی مملکت کی بساط بہت پھیل چکی ہے۔ سب علاقوں کے علماء کا اجماع کسی ایک فرعی مسئلہ میں میسّر آنا ناممکن ہے۔ اس لئے کوئی شخص فروع میں اجماع کا دعویٰ نہیں کر سکتا[2]

آپ منفرد شہر کے اجماع کو بھی —— جیسا کہ امام مالک کا مسلک ہے کہ جس مسئلہ میں اہل مدینہ متفق ہیں وہ اجماع ہے —— تسلیم نہیں کرتے تھے۔ آپ کی رائے ہے کہ کسی شہر کے لوگوں کو حق نہیں پہنچتا کہ محض اس لئے خبرِ واحد کو ترک کر دیں کہ اس پر ان کے اہلِ شہر کا عمل نہیں[3]

قیاس —— حضرت امام شافعی قیاس کو تسلیم کرتے ہیں اور حنفیہ کی طرح علتِ منضبطہ کو مدارِ قیاس قرار دیتے ہیں[4]

شریعت تعبّدی ہے

ہم دیکھ آئے ہیں کہ امام شافعی لفظ و عبارت کی لغوی اور ظاہری تشریح کے قائل تھے اور تاویل کو اسی صورت میں اختیار کرتے تھے کہ کوئی مضبوط دلیل اس کی مؤید ہو۔ ان کے اس نظریہ نے انہیں امام ابو حنیفہ کے اصول استحسان اور امام مالک کے اصول استصلاح کے مخالف کر دیا۔ حنفی اور مالکی نقطۂ نظر سے شریعت

---

[1] خضری [2] خضری۔ اعلام الموقعین [3] انصاف [4] انصاف

ہیں ایک حد تک اصول کی تلاش ہو سکتی ہے۔ لیکن امام شافعی اس مشرب کے خلاف بہت زور کا استدلال کرتے ہیں۔ آپ کو یہ تسلیم نہیں کہ شریعت میں "کیوں" اور "کیسے" کہا جائے۔ شریعت میں اصول تلاش کرنا یا نفع و ضرر کو حکم کی بنیاد بنانا درست نہیں جانتے تھے۔

امام شافعی کے اس اصول کا ایک قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آپ نیّت INTENTION پر حکم نہیں لگاتے۔ دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کم و بیش فرق کے ساتھ نیت پر حکم لگانا درست ہے۔

شافعی مسلک کی اشاعت

شافعیہ میں جس قدر مجتہد اٹھے کسی اور مسلک میں نہیں ہوئے۔ اسلامی دنیا کا کوئی خطّہ نہیں تھا جہاں اس مسلک نے کچھ نہ کچھ رواج نہیں پایا۔ سب سے زیادہ پھیلاؤ مصر میں ہوا۔[1] آج کل بھی اس کے زیادہ پیرو مصر میں ہیں یا انڈونیشیا وغیرہ میں۔ فلسطین، عراق اور حجاز میں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

---

[1] انصاف

امام احمد بن حنبل مَروزِی

حالاتِ زندگی

امام احمد بن حنبلؒ نے ۱۶۴ ہجری میں بغداد میں ولادت پائی۔ آبائی شہر مَرو کی نسبت سے مَروزِی کہلاتے ہیں[1]۔ آپ قبیلہ بنو شیبان سے تھے۔ آپ کے والد کا نام محمد اور دادا کا حنبل تھا۔ آپ دادا کے نام سے احمد بن حنبل مشہور ہوئے۔ آپ کے والد ایک فوجی افسر تھے۔ آپ کے دادا حنبل اُموی دور میں خراسان کے شہر سَرخس کے گورنر تھے۔ عباسی تحریک سے وابستہ ہو کر نہ صرف اس وقیع عہدہ سے دست کش ہوئے بلکہ شدائد و مصائب کو بھی لبیک کہا[2]۔

جناب احمد بن حنبل طفلی ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے[3]۔ مالی حالت بہت تنگ تھی۔ والدہ کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی نے نیک سرشت اور عالی دماغ بیٹے کے لئے اخلاقی پاکیزگی اور علمی کمالات کی راہ ہموار کر دی۔

---

[1] مناقب احمد بن حنبل از ابن جوزی۔ تاریخ ابن عساکر (مختصر)

[2] ابن جوزی۔ ابن عساکر (مختصر)۔ تاریخ اسلام از ذہبی۔

[3] ابن جوزی۔

آپ نے بچپن میں قرآن شریف حفظ کر لیا[1]۔ چودہ برس کے تھے کہ تحصیل حدیث میں مصروف ہوئے۔ پہلے امام ابویوسف[2] کی شاگردی کی پھر دیگر اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ سات آٹھ برس کے بعد ۱۸۷ ہجری میں بصرہ تشریف لے گئے[3]۔ کچھ دن کوفہ بھی رہے۔ غربی ساتھ ساتھ تھی۔ اس پردیس میں اینٹ کا سرہانہ رکھ کر سوتے تھے[4]۔ اس کے بعد حجاز، شام، اور یمن کی بار بار راہ پیمائی کی۔ پانچ حج کئے۔ ان میں سے تین پیدل تھے[5]۔

حجاز میں امام شافعی سے ملاقات ہوئی اور ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔

آپ کی ملاقات ۱۹۹ ہجری میں امام عبدالرزاق سے مکہ میں ہوئی لیکن آپ نیت کر کے چلے تھے کہ یمن جاکر اس بے عدیل محدث سے اس کے شہر صنعا میں حدیث حاصل کروں گا۔ اس لئے مکہ میں ملاقات کے باوجود ان سے استفادہ نہ کیا۔ آپ نے یمن کا سفر کیا اور بہت مشکلوں سے دوچار ہوئے۔ شتربانوں کی ملازمت کر کے صنعا پہنچے۔ وہاں دو برس تنگی میں بسر کئے۔ استاد نے اعانت کرنا چاہی لیکن ان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ واپسی کا سفر بھی مشکلات سے معمور تھا۔ رستہ میں پاؤں شق ہو گئے[6]۔

آپ نے کئی اساتذہ سے علم حاصل کیا اور ایک ایک حدیث کی چھ چھ سات سات سندیں جمع کیں[7]۔

---

[1] ابن جوزی [2] ابن جوزی - البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ [3] البدایہ والنہایہ
[4] ابن عساکر (مختصر) [5] ابن عساکر (مختصر) [6] البدایہ والنہایہ - ابن جوزی - ابن عساکر (مختصر)
[7] ابن جوزی۔

علومِ حدیث میں صاحبِ کمال ہو چکنے کے باوصف چالیس برس سے اِدھر تدریس کی ذمہ داری نہ سنبھالی۔[۱]

آپ کے درس کی دو نشستیں ہوتی تھیں۔ ایک خصوصی طلبہ کے لئے مکان پر منعقد کرتے تھے۔ دوسری احاطۂ مسجد میں عمومی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اس میں کم و بیش پانچ ہزار سامعین ہوتے تھے۔

آپ چودہ پندرہ برس اطمینان سے تدریس فرماتے رہے۔ اس کے بعد ابتلاء کا دور شروع ہوا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ عباسی بادشاہ مامون پر معتزلہ کا بہت اثر تھا۔ معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔ جو اس عقیدہ کو نہیں مانتا وہ مرتد ہے لہذا واجب القتل۔ مامون نے ۲۱۸ ہجری میں اس کی نہایت شدّومد اور جور و جفا سے اشاعت شروع کی۔[۲] جن علماء نے ہم نوائی نہ کی انہیں پابندِ سلاسل کر کے زندان میں ڈلوادیا اور ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے۔ راہِ حق کے ان ستم برداروں کے سرخیل امام احمد بن حنبلؒ تھے۔

جناب احمد بن حنبلؒ کو بیڑیوں میں جکڑ کے مامون کے پاس لے چلے۔ رستہ ہی میں تھے کہ مامون کی موت کی خبر آئی۔ اب اس کا بھائی معتصم تخت نشین ہوا۔ اس نے مامون کا شعار جاری رکھا۔ مامون صاحبِ علم تھا۔ معتصم اس جوہر سے عاری تھا، اس لئے سفاکی میں مامون سے بھی بازی لے گیا۔[۳]

امام احمد زندان نشین کر دیے گئے۔ ایک دن آپ کو معتصم کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہاں معتزلی علماء اکٹھے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا ان سے

۱؎ ابن جوزی ۲؎ البدایہ والنہایہ ۳؎ البدایہ والنہایہ۔ ابن جوزی۔ ابنِ عساکر (مختصر)

مناظرہ ہوا۔ فرمایا، قرآن و سنت سے دلیل لاؤ تو مانوں۔ بحث گرم ہوئی امام بے خوف ہو کر بلند آواز سے بولے۔ معتصم آپ کے علم و فضل کے قدر دان تھے اس لئے آپ کو گاہے ترغیب اور گاہے تخویف سے رام کرنا چاہا لیکن بے کار۔ آخر جلّادوں کو تازیانے مارنے کا حکم دیا۔ آپ کی قمیص اتار دی گئی۔ ایک ایک جلّاد آکر پوری طاقت سے دو کوڑے مارتا۔ آپ بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ ہوش میں آتے تو پھر تازیانوں کی بارش ہوتی۔ تین بار ایسا ہوا۔ بے ہوشی میں آپ کو پاؤں تلے روندتے [1]

کئی علماء نے جان کے خوف سے معتزلی عقیدہ محض زبان سے تسلیم کر لیا۔ آپ کو حفظِ جان کے لئے بارہا مشورہ دیا گیا کہ تقلید کریں۔ لیکن آپ نے نہ مانا۔ ایک دفعہ دورانِ اسیری میں ایک شاگرد نے قرآنِ حکیم کا حوالہ دے کر کہا کہ جان ہلاک نہ کریں۔ آپ نے فرمایا، خلیفہ کے قصر میں جا کر ایک نظر ڈال آؤ۔ شاگرد نے آکر دیکھا تو احاطہ میں لاتعداد لوگ کاغذ اور قلم دوات لئے کھڑے تھے۔ اس نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس انتظار میں ہیں کہ احمد کے ارشادات تحریر کریں۔ شاگرد نے جا کر امام کو بتایا۔ انہوں نے فرمایا، کیا ان سب کو گمراہ کر دوں؟ جان دے دوں گا لیکن ان کو گمراہ نہیں کروں گا [2]

معتصم نے دیکھا کہ امام احمد کو اپنے مقام سے ہلانا ناممکن ہے تو آپ کو رہا کر دیا۔ معتصم کے بعد واثق تخت نشین ہوا۔ اس نے جناب

---

[1] ابن جوزی

[2] ابن جوزی ص ۳۲۹

امام کو حکم دیا کہ جس علاقہ میں میں موجود ہوں وہاں نہ رہنا۔ واثق کی حکومت کے پانچ برس آپ کو جلا وطنی میں کاٹنا پڑے[۱] واثق کا جانشین متوکل ہوا۔ وہ اہل السنت والجماعت سے تھا۔ اس کے دل میں امام احمد کے لئے بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ دیکھ کر ایک بد خواہ نے اس سے چغلی کھائی کہ امام احمد علویوں کے ہمدرد ہیں۔ ان کے پاس ایک علوی مفرور رہتا ہے۔ متوکل کے حکم سے بغداد کے حاکم نے اچانک رات کے وقت آپ کے مکان پر چھاپہ ڈلوایا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ امام کی بے گناہی کی ثابت ہو گئی[۲]

متوکل نے ایک خطیر رقم آپ کے زادِ راہ کے لئے بھیجی اور لکھا کہ سامرہ تشریف لائیے جو متوکل کا دارالخلافہ تھا۔ آپ نے تھیلی لے لی مگر رات بھر آنکھ نہ لگی۔ صبح ہوتے ہی کل رقم غریبوں اور یتیموں پر تقسیم کر دی۔ خالی تھیلی بھی دے ڈالی۔ سامرہ کا سفر آپ نے اپنے خرچ پر کیا[۳]

بادشاہ کا مال آپ کے نزدیک حلالِ خالص نہ تھا۔ آپ نے خلیفہ کے متعین کردہ محل میں قیام نہ کیا اور نہ اس کا ساز و سامان کام میں لائے۔ اس کے بھیجے ہوئے کھانوں کو ہاتھ نہ لگایا۔ متواتر روزے رکھتے رہے۔ رات کو کچھ ستو پی لیتے یا کھجور یا روٹی کا کوئی ٹکڑا کھا کر افطار کرتے۔ پندرہ سولہ روز کے بعد آپ کو واپسی کی اجازت ملی۔ رستہ کے لیے بادشاہ نے کھانا ساتھ کر دیا۔ لیکن آپ کے کس کام ؟ بغداد پہنچے تو مسلسل فاقوں سے نڈھال تھے۔ یہ ۲۲۷ ہجری کا واقعہ ہے[۴]

---

[۱] ابن جوزی [۲] مناقب ابن جوزی

[۳] صفوۃ الصفوہ۔ ابن جوزی ص ۳۶۳

[۴] صفوۃ الصفوہ۔ ابن جوزی۔ ابن عساکر (مختصر)

یہ ہم سامرّا کے دوران قیام متوکل سے ملنا منظور نہ تھا۔ ایک دن محل گئے لیکن اس شرط پر کہ متوکل سے دو بہ دو ملاقات نہ ہو گی۔ بادشاہ نے جھروکے میں بیٹھ کر دیدار حاصل کیا۔

اس سفر کے بعد آپ کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ چار برس کے بعد ۲۴۱ ہجری میں چند دن بخار سے بیمار رہ کر جمعہ کے روز اس دنیا سے سفر کیا۔ وفات کی خبر پھیلی تو بغداد کے کوچہ و بازار سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لاکھوں مردوں اور عورتوں نے نمازِ جنازہ پڑھی[1]

آپ نے ۷۷ برس کی عمر پائی جو شروع سے آخر تک فقر و فاقہ میں کٹی۔

اوصاف و خصائل

امام احمد کو سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبّت تھی۔ زندگی کے ہر جزئیہ میں رسولِ مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا عکس اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ جو شخص امام احمد سے محبّت رکھتا ہے اسے سنّتِ مصطفیٰ سے محبت ہے[2]

امام احمد سادہ رُو، پاک باطن، فقر پیشہ اور غنی دل تھے۔ نہایت معمولی جایداد تھی۔ اس کے کرایہ کے سوا اور کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ اکثر تنگ دست رہتے لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ بارہا دوستوں اور مدّاحوں نے مدد کرنا چاہی لیکن قبول نہ کی۔ آپ کو کسی کا احسان تک گوارا نہ تھا۔ ایک دفعہ آپ کی قینچی کنوئیں میں گر گئی۔ آپ کے ایک کرایہ دار نے نکال دی۔ اسے تین ماہ کا کرایہ معاف کر دیا۔ یہ رقم قینچی کی قیمت سے کئی گنا زیادہ تھی[3]

---

[1] ابن جوزی - ابن عساکر (مختصر) [2] ابن جوزی [3] ابن عساکر (مختصر)

خرچ پورا کرنے کے لئے ہاتھ سے مشقت کرنی پڑتی تھی۔ گاہے سوت کاتتے اور کپڑا بُن کر بیچتے تھے۔ یہ نوبت بھی آئی کہ لوگوں کا سامان ڈھویا[1]۔

محنت کشی کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ بیٹے کی ٹانگوں پر نظر گئی۔ دیکھا تو ملائم تھیں۔ فرمایا، یہ کیا ٹانگیں ہیں؟ ننگے پاؤں کیوں نہیں چلتے کہ کھردری ہو جائیں[2]۔

قرض لیتے تو انتہائی مجبوری سے اور یہ دیکھ کر کہ ادا کرنے کے اسباب نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ مکّہ میں تھے کہ کپڑے چوری گئے۔ مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔ چند روز کے بعد ایک ساتھی نے آکر خبر لی اور قرض یا عطیّہ کے طور پر چند دینار پیش کئے۔ آپ نے اس شرط پر لئے کہ عوض میں کتابت کرکے دوں گا[3]۔

حلال کمائی کا بہت دھیان رکھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ رزقِ حلال ہی سے گدازِ قلب پیدا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک دکاندار کے پاس تانبے کا ایک برتن رہن رکھا۔ چند یوم کے بعد چھڑانے گئے۔ وہ دو برتن نکال لایا جو بالکل مشابہ تھے۔ آپ پہچان نہ سکے اور اپنا برتن بھی چھوڑ آئے کہ غلطی میں دوسرے کا مال گھر میں نہ آجائے[4]۔

سرکاری تعلقات سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ امام شافعی نے ہارون الرشید سے آپ کے لئے عہدۂ قضا کا فیصلہ کیا اور آپ کو آمادہ کرنا چاہا۔ آپ نے فرمایا، میں آپ سے علمِ دین پڑھنے آیا ہوں اور آپ

---

[1] ابن عساکر [2] ابن جوزی ص ۲۴۸ [3] ابن عساکر د مختصر، [4] ابن عساکر۔ صفوۃ الصفوۃ۔ ابن جوزی۔

مجھے نوکری سونپنا چاہتے ہیں۔ امام شافعی کو یہ جواب سُن کر حیا آگئی۔[1]

آپ کے ایک بیٹے صالح نام نے آپ کی منشاء کے برخلاف سرکاری وظیفہ قبول کر لیا تھا۔ آپ نے اس سے تعلقات منقطع کر لئے۔ ایک بار تین روز کا فاقہ گزر گیا۔ کہیں سے آٹا میسّر آیا تو بیوی نے گوندھا اور صالح کے ہاں سے تنور میں پکا لائیں۔ جناب امام کو معلوم ہوا تو روٹی کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ صالح کے گھر کا دروازہ بند کر دو۔[2]

آپ صبر و ثبات کے پیکر تھے۔ جس وقت معتصم کے دربار میں پابہ زنجیر پیش ہوئے تو موت سامنے تھی۔ ایسے میں بھی ایک فقیہ پر نظر گئی تو پوچھا کہ مسح کے بارے میں امام شافعیؒ کا فتوٰی بتا سکتے ہو؟ یہ دیکھ کر آپ کا دُشمن ابن ابی دوّاد کہہ اُٹھا کہ اس شخص کو دیکھو، موت کے مُنہ میں جا رہا ہے اور فقہ کی طلب میں ہے۔[3]

آپ کے حلم و درگزر کے بھی کئی بے نظیر واقعات ہیں۔ ایک دفعہ امام ابوحنیفہ کے کسی مسئلہ سے ناموافقت کی تو ان کا ایک معتقد بپھر اٹھا اور آپ کو سخت کلمات کہہ گیا۔ دوسرے دن علی الصباح نادم ہو کر معافی چاہنے آیا۔ آپ نے فرمایا، تم سے جُدا ہوتے وقت ابھی میرے قدم بھی نہ اٹھے تھے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا۔ حد یہ تھی کہ معتصم کی طرف سے بھی دل میں کوئی غبار نہ تھا۔ خلیفہ متوکل کے پاس ایک شخص نے آپ کی چغلی کھائی اور نتیجتہً آپ کی خانہ تلاشی ہوئی۔ آپ بے گناہ نکلے۔ متوکل نے

---

[1] ابن عساکر (مختصر)، البدایہ والنہایہ [2] ابن عساکر (مختصر)، البدایہ والنہایہ
[3] ابن جوزی ص ۳۲۰

اس بدخواہ کو گرفتار کر لیا۔ اور امام احمدؒ سے پوچھ بھیجا کہ آپ کی مرضی ہو تو اسے مار ڈوں۔ آپ نے درگزر کیا۔[۱]

سیم و زر کے جال سے بچ نکلنا یقیناً مشکل ہے لیکن نام و نمود کے پھندے سے محفوظ رہ جانا بہ درجہا مشکل تر ہے۔ جناب امام کو اللہ تعالیٰ نے اس دام سے بھی بچائے رکھا۔ آپ کو شہرت سے بہت وحشت تھی۔ کہا کرتے تھے کہ وہ آدمی خوش نصیب ہے جس کا ذکر گم ہے۔ ایک دفعہ کہا، اللہ کی قسم اگر ممکن ہو تو میں اس شہر کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں میرا نام لینے والا کوئی نہ ہو۔[۲]

تواضع اور انکسار آپ کا وصفِ غالب تھا۔ تاہم شخصیت میں وہ دبدبہ تھا کہ آپ کی مجلس پر ہمیشہ تمکین و وقار کی فضا طاری رہتی تھی۔ حاضرین میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کی موجودگی میں دوسرے سے مزاح یا دل لگی کی بات بھی کہہ سکے۔[۳]

دروازہ پر حاضری دینے والوں کی مرعوبیت کا یہ حال تھا کہ آپ کے دروازہ کے بجائے آپ کے چچا کا دروازہ کھٹکھٹاتے جو آپ کے مکان کے برابر تھا۔ آپ سن کر باہر تشریف لے آتے۔[۴]

تدوینِ فقہ و تصنیفات

امام احمد بن حنبل پر حدیث و اثر[۵] کا بہت غلبہ تھا اس لئے آپ نے فقہ میں کوئی کتاب مدون نہیں کی۔ اوروں کو بھی اپنے اقوال لکھنے سے منع کرتے تھے۔

آپ نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں ان کا تعلق حدیث اور آثارِ سلف سے ہے

---

[۱] ابن جوزی ص ۳۶۲ [۲] ابن جوزی [۳] ابن جوزی [۴] ابن جوزی

[۵] اثر کا لفظ حدیث اور اقوالِ سلف کے لئے آتا ہے۔

مثلاً التاریخ، الناسخ والمنسوخ، فضائل الصحابہ، کتاب الرد علی الجہمیہ کتاب الرد علی الزنادقہ - المناسک الکبیر- المناسک الصغیر۔ کتاب الزہد[1]

سب سے زیادہ شہرت آپ کی تالیف المسند کو ہے۔ اس ضخیم کتاب میں تقریباً ۳۰ ہزار حدیثیں ہیں۔ جو حدیث اس میں نہیں اس کے بارہ میں کہاجا سکتا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔

امامِ احمدؒ کا مسلک فکری خطوط

امام احمدؒ کی فکری دنیا نہایت سادہ تھی۔ ائمہؒ متقدمین کی طرح علم کلام اور مناظرہ بازی سے نفور تھے۔ بدعتی فرقوں کے پیروؤں کے پیچھے نماز پڑھنے کے قائل نہ تھے۔

امام احمدؒ کی سادہ روی یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ فقہی دائرہ کے اندر بھی حدیث و اثر میں محدود رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ سے پہلے حنفی، مالکی اور شافعی نظام ہائے فکر موجود تھے۔ آپ نے ان کا بغور مطالعہ کیا لیکن ان میں سے کسی کی پابندی قبول نہ کی۔

آپ نے نہایت سادہ راہ اختیار کی۔ کتاب و سنت اور صحابہؓ کے اجماع اور اقوال کی اس طور سے پیروی اختیار کی کہ جہاں ضعیف حدیث یا سلف کا کوئی قول بھی مل جاتا وہاں ذاتی اجتہاد کی طرف دھیان نہیں کرتے تھے۔ اگر صحابہؓ کی آراء میں اختلاف دیکھتے اور کتاب و سنت کی رُو سے ان میں ترجیح قائم نہ کر سکتے تو فتوٰی دونوں قولوں پر چھوڑ دیتے۔ جس مسئلہ میں خود قیاس کرنے پر مجبور ہوتے وہاں بھی اگر

---

[1] بستان المحدثین

دو احتمال پیش آجاتے تو دونوں بیان کر دیتے تھے۔ لہٰذا آپ کے ہاں دو قولوں کے مسائل بہت ہیں۔

امام احمدؒ کی سادہ مشربی ہی ان کی فقہ کی جان ہے بلکہ وجۂ امتیاز ہے۔ بعض اہلِ علم نے تو اسی فکر کی سادگی اور بے تکلفی کی بنا پر انہیں فقیہہ ہی تسلیم نہیں کیا لیکن جس ہستی کے مذہب کو دیگر مذاہبِ ثلاثہ کے شانہ بہ شانہ قبول حاصل ہوا اسے فقیہہ تسلیم نہ کرنا درست نہیں۔ آپ کا مسلک بھی دیگر مسالک کی طرح ایک الگ فکری نظام رکھتا ہے۔

حدیث —— خبرِ واحد ضعیف بھی ہوتی تو اسے قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک صحابیہ فاطمہؓ نام سے حدیث سُنی لیکن اس عورت کا اعتبار نہ کیا اور اس کے برعکس اپنی رائے سے فتویٰ دیا۔ امام احمد حضرتِ عمرؓ کے اس فتویٰ کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور جنابِ فاطمہؓ کی روایت کے بموجب فتویٰ دیتے تھے[1]

آپ کے عہد تک ہر اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے جو صحیح نہ ہوتی۔ لہٰذا ضعیف حدیث کے بھی مختلف درجے تھے۔ آپ حدیث کی سند کو جانچتے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امام شافعی بالعموم حدیثِ مُرسل کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ امام احمد کے عہد تک حدیثِ مُرسل کا اعتبار اور بھی گھٹ گیا تھا۔ لیکن جب حضرت امام احمدؒ کو قوی روایت نہ ملتی تو حدیثِ مرسل ہی کو اختیار کر لیتے اور اسے اپنے قیاس پر ترجیح دیتے تھے[2]

اقوالِ صحابہ —— اجماعِ صحابہ کو حجت مانتے تھے۔ جہاں صحابہؓ

---

[1] اعلام الموقعین [2] اعلام الموقعین

کا اختلاف ہوتا وہاں ترجیح کا پہلو تلاش کرتے تھے اور جب اس میں کامیاب نہ ہوتے تو اختلافی اقوال بیان کر دیتے تھے[۱]

اجماع —— اجماع کے بارہ میں آپ امام شافعیؒ سے متفق تھے۔ آپ کی رائے ہے کہ صحابہ کے بعد حقیقی اجماع ختم ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں مسئلہ میں اجماع ہے تو وہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی عالم کو اختلاف ہو جس کا علم اجماع کے اس دعویدار کو نہ ہو[۲]

قیاس —— قیاس کا استعمال آپ فقط اس صورت میں کرتے تھے کہ کتاب و سُنّت یا اقوالِ صحابہؓ میں سے کوئی چیز بھی صراحتہً رہنمائی نہ کرتی۔ قیاس میں آپ اصل و فرع کے وصفِ مشترک کو پیشِ نگاہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی عِلّتِ غائی یعنی مقصود کو دیکھتے تھے[۳] دیگر ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک قیاس کی بنیاد وصفِ مشترک ہے جیسا کہ قیاس کے عنوان میں ہم لکھ آئے ہیں۔

مصلحتِ عامّہ —— جس اصول نے امام احمد کے مسلک کو پہناوری اور سرمدی تر و تازگی عطا کی ہے وہ مصلحتِ عامہ کا اصول ہے۔ یہ اصول امام مالک کے مسلک میں بھی ہے لیکن جو وسعت اسے حنبلی مذہب میں حاصل ہے وہ مالکیہ کے ہاں نہیں۔

مصلحتِ عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں کتاب و سُنّت اور اجماعِ صحابہؓ خاموش ہوں وہاں حکومتِ وقت عوام کی مصلحت اور دفعِ ضرر

---

۱ اعلام الموقعین ۲ اعلام الموقعین ۳ حیات احمد بن حنبلؒ (اردو)

کو ملحوظ رکھ کر آئین سازی کرے۔ مثلاً تاجروں کی ذخیرہ اندوزی اور منافع پرستی کی وجہ سے بھاؤ چڑھ جائیں تو حکومت کو حق حاصل ہے کہ قیمتیں مقرر کر دے۔ آپ کا ایک اور فتویٰ یہ ہے کہ کاریگر کام کرنے سے انکار کر دیں تو حکومت جائز اُجرتیں دے کر انہیں کام پر مجبور کر سکتی ہے۔[1]

مصلحتِ عامہ کی ایک طبعی شاخ سدِّ ذرائع ہے، یعنی ضرر سے بچنے کے لئے اس کے ذرائع (MEANS) کی روک تھام کرنا۔ مثلاً امام احمدؒ کا فتویٰ ہے کہ بدامنی کا خدشہ ہو تو حکومت اَسلحہ پر پابندی لگا سکتی ہے۔[2]

سدِّ ذرائع کے ذیل میں نیت کا سوال بھی اٹھتا ہے۔ امام احمدؒ کے ہاں نیت کا بہت لحاظ ہے۔ آپ کا فتویٰ ہے کہ کسی شخص نے قتل کی نیت سے تلوار خریدی تو یہ سودا باطل ٹھہرے گا چاہے حکومت کی طرف سے اَسلحہ کی خرید و فروخت پر پابندی نہ ہو۔

حنبلی مسلک کی اشاعت

امام احمد کے بیٹے عبد اللہ (۲۱۳ - ۲۹۰ھ) نے آپ سے حدیث کی روایت کی اور مُسند کو شائع کیا۔ آپ کے بیٹے صالح نے آپ کے فقہی سرمایہ کو عام کیا۔ صالح طرطوس کے قاضی تھے۔ ان کو موقع ملا کہ اپنے والدِ ماجد کے فتاویٰ کو عملی طور سے برتیں۔ اس طرح حنبلی فقہ کی کامیابی تجربہ کی امتحان گاہ میں ثابت ہو گئی۔ حنبلی فقہ کو ایسے پیروؤں کی ایک وافر تعداد میسّر آئی جو علم و فضیلت کی دنیا میں یگانہ تھے۔

---

[1] حیات امام احمد بن حنبل (اردو)   [2] حیات احمد بن حنبل (اردو)

حنبلیّت کی اشاعت دیگر مکاتبِ ثلاثہ کے مقابلہ میں کم ہوئی۔ امام احمد بن حنبلؒ خود نہایت وسیع القلب تھے۔ لیکن ان کے بعد حنابلہ نے جہاں جہاں رسوخ پایا عوام کی داروگیر میں سختی کی۔ غالباً اسی سبب سے اس کی مقبولیّت کم ہوئی۔ آج کل شام، فلسطین اور عراق میں اس کے پیرو ملتے ہیں سعودی عرب کی حکومت کا مذہب بھی اس سے بہت متاثر ہے ؎

امتحان ایم اے اسلامیات چوتھا پرچہ
قدیم وجدید
تاریخ مسلمانانِ عالم

از پروفیسر محمد رضا خاں ایم اے (ریٹائرڈ پرنسپل)

مسلمانان عالم کے عروج و زوال کی داستان پر تنقیدی تبصرہ کے علاوہ مغربی اقوام کے سامراجی عزائم اور فریب کاریوں کا تذکرہ شامل ہے۔

از ابتدائے اسلام تا بیسویں صدی مع عالم اسلام ، انڈونیشیا اور پاکستان کا قیام مع مشقی سوالات۔ قیمت 20/۰۰ روپے

ایم اے اسلامیات کے لیے باقی تمام پرچے مکمل

ہیں۔ یہ سلسلہ کتب نئے سلیبس کے مطابق (۷۳ - ۱۹۷۲ء) ہے۔ قابل مصنفین نے ہر پرچہ پر سلیبس کے تمام عنوانات مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کیے۔ تفاسیر میں مجوزہ تفاسیر کے خلاصے اور احادیث میں مطالب اور ان کے لغوی مباحث۔ فقہ مختصر اور جامع۔

پانچواں پرچہ : تقابلِ ادیان 15/- روپے

چھٹا پرچہ : اسلام اور معاشرتی معاشی اور سیاسی افکار 15/-

ساتواں پرچہ : اسلام اور سائنس و اسلام اور فلسفہ 12/- روپے

آٹھواں پرچہ : مقالات علوم اسلامیہ برعذہ کتب 9/- روپے

6/- روپے

مقامی دکانداروں سے حاصل کریں

علمی کتاب خانہ ، کبیر سٹریٹ ، اردو بازار لاہور